سلسلۂ مطبوعات مجلس
۱۱۵

کاروانِ مدینہ

مختلف تقریروں اور مضامین کا مجموعہ جن کا تعلق ذاتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی سیرتِ پاک، اس کی تعلیمات، پیام، اس کے عطیات و احسانات اور اس کے عالمگیر نتائج و اثرات سے ہے، آخر میں ایک نعتیہ تمثیلی مشاعرہ بھی ہے، جس میں فارسی اور اردو کے مشہور شعراء نے بارگاہِ نبویؐ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے

مولانا ابوالحسن علی ندوی

پانچواں ایڈیشن

۱۴۱۴ھ — ۱۹۹۴ء

(اضافوں اور ترمیمات کے بعد)

کتابت ——————— ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ——————— لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ (آفسٹ)

صفحات ——————— ۱۹۲

قیمت ——————— Rs. 35/-

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

مکتبۂ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ

کاروانِ مدینہ

۱۳۹۸ھ۔۱۹۷۸ء

اردو	تیسرا ایڈیشن	لکھنؤ
عربی	چوتھا ایڈیشن	مدینہ طیبہ
انگریزی	پہلا ایڈیشن (زیرِ طبع)	لکھنؤ

بسم الله الرحمن الرحيم

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ ق وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥

فہرست مضامین

"کاروانِ مدینہ"

سیدالعرب والعجم کے حضور میں شعرائے عجم کا خراج عقیدت ۱۵۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرم مولانا ابوالحسن علی ندوی!

ہمارے یہاں شام میں عوام الناس کی ایک مثل ہے کہ "خط اپنے عنوان سے پہچان لیا جاتا ہے" آپ کی کتاب کے نام (الطریق الی المدینہ) نے اس سے پہلے کہ اسے کھولوں میرے اندر زندگی کی ایک لہر دوڑا دی، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس عنوان نے مجھے اپنی زندگی کے طویل سفر میں ۳۴ سال پیچھے لوٹا دیا ہے، پوری دو تہائی صدی پیچھے، مجھے نظر آیا کہ میں حجاز کے صحرا میں ہوں، مجھ پر اور میرے دوستوں پر وہاں پچاس دن گزر گئے ہیں، اس ریگ زار میں اوپر سے دہکتا ہوا سورج ہے اور نیچے جھلستی و سلگتی ہوئی ریت، ایک ٹیلے سے ہم اُبھرتے ہیں اور ایک بیابان میں کھو جاتے ہیں، پیاس سے زبان پر چھالے، اور راستہ بھٹک جانے کے ڈر سے جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، ہماری ساری امیدیں اور آرزوئیں، ایک آرزو اور ایک تمنا میں آکر سمٹ گئی ہیں، وہ یہ کہ ہم کو مدینہ کی زیارت نصیب ہو۔

میرے بھائی! ہم مدینہ کے راستہ میں بھٹک گئے تھے، ہم نے بھوک کی تکلیف اور پیاس کی سوزش کے مزے چکھے، موت آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آتی تھی، تکان اور خوف کے کڑوے گھونٹ پیئے، یہاں تک کہ پورا دن گزر گیا، ہمارے ساتھ ایک بدو رہنما تھا، جس کی زبان پر تالا

لگا رہتا تھا، اور تیوری چڑھی رہتی تھی، اچانک اس کے افسردہ چہرہ میں شگفتگی، اور زبان میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نے ایک جملہ کہا اگر اشرفیوں کا توڑا دیا جاتا تو مجھے وہ اس جملہ سے زیادہ عزیز نہ ہوتا، وہ جملہ جس نے ہمارے خوف کو اطمینان، ہماری بھوک اور پیاس کو سیری و سیرابی، اور ہمارے تکان کو آرام و راحت سے بدل دیا، یہ جملہ ایک جادو تھا (اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ الفاظ میں بھی جادو ہوتا ہے) اس بدوی کا جملہ تھا، ھذا أُحد (یہ رہا احد) آپ ایک عاشقِ صحرائی کا تصور کیجئے کہ جس پر ہجر کا ایک طویل عرصہ گزر چکا ہو اور جس کو بیماریٔ عشق نے جاں بلب کردیا ہو، پھر اچانک اُسے خبر دی جائے کہ یہ محبوب کا گھر ہے! یہ خیال رہے کہ وہ جسمِ خاکی سے تعلق رکھنے والی محبت ہے اور یہ روح کی عشق و سرگشتگی کا معاملہ، وہ ارضی خواہشات کی محبت ہے جو زائل ہو جاتی ہے، اور یہ ایک آسمانی جذبہ کی کارفرمائی جس کو فنا نہیں۔

دو تہائی صدی کی اوٹ کے پیچھے مجھے اب تک اچھی طرح سے یاد ہے کہ کس طرح اس جملہ نے ہمارے اعصاب میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی، دم کے دم میں ہم اپنی سواری کو تیز تر کرنے لگے، اور ڈرائیوروں کو تیز چلانے کی تاکید کر رہے تھے، کیونکہ ہم موٹروں میں سوار تھے، اور ہماری موٹریں سب سے پہلی موٹریں تھیں جنھوں نے شام و حجاز کے درمیان کے ریگستان کو عبور کیا تھا اور یہ صحرا اپنی تاریخ میں پہلی بار اس نئے تجربہ (موٹر) سے آشنا ہو رہا تھا، ڈرائیوروں میں چستی آئی، بلکہ ہم نے محسوس کیا کہ خوشی کی لہر اور وصال کی مستی نے جس طرح ہمیں سرشار کردیا ہے، اسی طرح موٹروں میں بھی تیزی، چستی اور شوق کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔

جب ہم اُحد کے پار سے گھوم کر آئے اور گنبدِ خضرا پر پہلی نظر پڑی تو ہماری زبان، ہمارے دلی احساسات کے اظہار سے قاصر رہی، جس طرح آج قلم قاصر ہے، ہم نے عاشقوں کی زبان

میں دل کی دھڑکن، اور آنسوؤں کی بارش کے ساتھ باتیں کیں، کیوں ہمارے دل نہ دھڑکتے! اور کیوں ہمارے آنسو نہ بہتے! ہم دیارِ حبیبؐ میں پہونچ گئے تھے، وہ دیار جس کے تصور میں ہم جیا کرتے تھے، اور جس کی یاد ہماری غذا تھی، سیرت پڑھتے ہوئے ان مقامات کے ذکر پر ہم محسوس کرتے تھے کہ یہ ہماری رُوح کا نشیمن اور ہمارے دل کا مسکن ہیں، ہمارا ملک جس میں ہم پیدا ہوئے صرف ہمارے جسموں کا وطن تھا، اور ایسا کب ہوا ہے کہ انسان کو اس کے جسم کا وطن دل کے وطن سے زیادہ عزیز ہو؟ روئے زمین پر کیا کوئی ایسا بدنصیب مسلمان ہے جو بلدِ رسول پر (خدا نہ کرے کسی ابتلا کے موقع پر) اپنا وطن قربان کرنے کے لئے تیار نہ ہو جائے، یا اگر خدا کے گھر پر کوئی مصیبت آئے تو اس گھر کی سلامتی کے لئے وہ اپنا اور اپنے متعلقین کا گھر نچھاور نہ کر دے؟!

انسان (ایک ادیب مورخ) کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس گھر کی زیارت کرے جہاں ایک ادیب پیدا ہو، اس شہر کو دیکھے جہاں پہلے ایک شاعر رہ چکا ہے، اس کے لئے وہ سفر کرتا ہے، اور وہاں پہونچنے کے لئے زرِ خطیر صرف کرتا ہے، اس راہ میں وہ سب خستگی و پریشانی برداشت کرتا ہے، اور سفر کی سب صعوبتیں جھیلتا ہے، کس طرح پھر ایک مسلمان کا دل اس شہر کے شوق میں بے تاب نہ ہو جائے جس کی زمین کو محبوب اعظم محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں نے سرفراز کیا ہے، جس کی ہوا میں آپ کے انفاس کی عطر بیزی ہے، اور جس کے پانی کو آپ کے حیات بخش لبوں نے مس کیا ہے، یہ عاشق انھیں راہوں پر چلتا ہے جہاں اس کے محبوب کے قدم پڑے ہیں، وہیں سجدہ میں سر جھکاتا ہے جہاں اس کے محبوب نے نماز پڑھی ہے، اس راہ سے مدینہ میں داخل ہوتا ہے جس راہ سے سفر ہجرت میں مدینہ میں داخل ہوا تھا، اور اس راہ سے باہر جاتا ہے جس راہ سے جنگ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کی فوج

آپؐ کی قیادت میں نکلی تھی، وہ اس معرکہ کے میدان کا مشاہدہ کرتا ہے، اور شہداء ابرار کی قبور پر کھڑا ہوتا ہے، پھر اس "روضہ" کی طرف واپس ہوتا ہے جو اس زمین میں جنت کا ایک ٹکڑا ہے، اس حجرۂ مبارک پر حاضری دیتا ہے جس کو مرقد مبارک ہونے کا شرف حاصل ہے، اور جو قیامت تک کے لئے بند کر دیا گیا ہے، پھر یہ عاشق زار اپنی زبان سے کہتا ہے "السلام علیک یا سیدی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی پہلی حاضری کے ان احساسات کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔

کیا بات ہے آج مجھ میں اس طرح کا شوق نہیں، اور نہ مجھے اس جیسی مسرت کا احساس ہے؟ کیا بات ہے کہ میں ان نعتیہ و شوقیہ اشعار کو پڑھتا ہوں جو شعراء عرب کے قلم سے نکلے ہیں جو میرے قلب کے ریشہ ریشہ کو اس طرح ہلا دیتے تھے جیسے باغبان ایک پھل دار درخت کی شاخ کو پکڑ کر ہلاتا ہے، اور میرے قلب سے جذبات اور علوی تاثرات کی اس طرح بارش ہوتی تھی جس طرح شاخ ہلانے سے رسیدہ پھل گرتے ہیں، کیا بات ہے کہ آج میں ان شعروں کو پڑھتا ہوں اور دل کی صرف ان شاخوں میں حرکت ہوتی ہے جنھیں عمر کی خزاں نے پتوں سے محروم کر دیا ہے، اور اب وہ صرف چوب خشک ہیں۔

کیا یہ بُعد زمانہ کا نتیجہ ہے؟ یا غفلت قلب کا؟ یا زمانہ نے مجھے بگاڑ دیا؟ یا یہ بات ہے کہ پہلے ہم خشکی کے راستہ سے آتے تھے، مدینہ کے راستہ میں کئی کئی ہفتے لگ جاتے تھے، شوق اور جذبہ ہمارا رہبر ہوتا تھا، ہمارے سینہ میں ہزاروں تمنائیں موجزن ہوتی تھیں، اب ہم دو یا تین گھنٹے میں راستہ طے کرنے لگے، شام یا مصر میں ہم ہوائی جہاز کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہیں، اور ابھی کھانے سے فراغت کر کے کچھ دیر سونے بھی نہیں پاتے کہ اس سیڑھی سے جدہ میں اتر جاتے ہیں، ہم نے اس طرح وقت کا فائدہ اٹھایا، لیکن جذبات و احساسات کا

نقصان کیا۔

میرا اپنے بارے میں اعتماد متزلزل ہوگیا تھا، لیکن برادرم ابوالحسن! جب میں نے آپ کی کتاب "الطریق الی المدینۃ" کو پڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ شوق میرے اندر پھر انگڑائی لینے لگا ہے، اور میرے سینہ میں پھر وہی تپش ہے، اس طرح پھر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا دل جوہر محبت سے بالکل خالی نہیں ہوا ہے، لیکن افکار زمانہ اور وقت نے اس جوہر کو گرد آلود کردیا تھا، آپ کی کتاب نے اس گرد کو ایک بار پھر صاف کردیا۔

ادب کی طرف سے بھی میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا، چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آیا، جس کی لے میں شریف[۱] رضی کے وقت سے لے کر عبدالرحیم[۲] برعی تک شعراء گاتے رہے، جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا، یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری ہے، لیکن بے ردیف اور قافیہ کی شاعری، برادرم ابوالحسن! آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کردیا۔

آپ نے مقدمہ کی فرمائش کی ہے، مجھے اس سے معاف رکھئے کیوں کہ اس کی نہ آپ کو ضرورت ہے اور نہ اس کتاب کو، کتابوں کے مقدمے کی وہی حیثیت ہوتی ہے، جو تاجر کے لئے دلال یا ایجنٹ کی، نئے تاجر کو دلال کی اس لئے تلاش ہوتی ہے کہ وہ اپنے

۱؎ عہد عباسی کا نامور ہاشمی شاعر جس کو بعض اہل ذوق اور صاحب نظر چند بلند ترین عرب شعراء میں شمار کرتے ہیں، ان کے کلام کا ایک مستقل مجموعہ الحجازیات کے نام سے موسوم ہے۔

۲؎ سیدی عبدالرحیم البرعی مشہور عارف و شاعر جن کا نعتیہ دیوان مشہور ہے اور مقبول خاص و عام رہ چکا ہے۔

غیر معروف سامان کی شہرت بڑھائے، جب خود خریدار تاجر کو ایجنٹ سے زیادہ جانتے ہوں، اور اس کا سامان خریدنے کے اس سے زیادہ متمنی ہوں جتنا تاجر اس کے فروخت کرنے کا تو ایسی حالت میں یہ ایجنٹ کیا کام دے سکتا ہے۔[1]

والسلام علیك ورحمة الله

علی الطنطاوی

مکہ مکرمہ ۱۳۸۵/۱/۱۴ھ

---

[1] ترجمہ ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی۔

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

پیش نظر کتاب مصنف کی مختلف تقریروں اور سیرت کے مضامین کا مجموعہ ہے، اپنے زمانہ، موقع و محل، اور محرکات و تقریبات کے لحاظ سے ان میں تفاوت و تنوع ہے، لیکن اس کثرت میں ایک وحدت بھی ہے اور وہ یہ کہ ان سب کا تعلق ایک ہی ذات گرامی سے ہے، یعنی ذات نبوی صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی سیرت پاک، اس کی تعلیمات، پیام، اس کے عطیات و احسانات اور اس کے عالمگیر نتائج و اثرات، اور ان سب کا مقصد ایک ہے یعنی اس ذات کی عظمت ذہن میں اور اس کی محبت اور جذباتی لگاؤ قلب میں پیدا کرنا، اس لئے باوجود اسلوب و طرز بیان اور موضوع و عنوان کے اختلاف و تنوع کے ان مضامین میں کوئی انتشار یا اعادہ و تکرار محسوس نہیں ہوگا۔

ان تقریروں اور مضامین کا بیشتر حصہ پہلے عربی میں لکھا گیا تھا پھر اس کو مصنف نے خود یا اس کے بعض عزیزوں نے اردو میں منتقل کیا، اور وہ مختلف موقر رسائل و مجلات میں شائع

ہوئے، مصنف کو کچھ عرصے سے یہ احساس کھٹک رہا تھا اور دل میں چٹکیاں لیتا تھا کہ ممالک عربیہ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کا تعلق (خصوصًا وہ جو عرب قوم پرستی کی تحریک سے متاثر ہیں اور جن پر اس سحر سامری کا جادو چل گیا ہے جس کو کچھ عرصہ سے مصر میں جگایا گیا ہے) اس ذات گرامی سے جو ان کی ہر طرح کی سعادت کا سرچشمہ اور سررشتہ ہے اور جس سے ان کو دین و دنیا کی دولت و عزت ملی اب بہت مضمحل اور کمزور پڑ گیا ہے اور زیادہ تر ضابطہ کا اور قانونی ہو کر رہ گیا ہے جس میں عشق کی شوریدگی اور زندگی کی بالیدگی نہیں، حالاں کہ اس طرح کا ذاتی وجذباتی تعلق جس میں وہ سراپا محبوبیت ذات اپنی ذات اور اپنے عزیز ترین اہل تعلق اور عزیز ترین مال و متاع سے زیادہ عزیز و محبوب ہو قرآن و حدیث کے نصوص کی رو سے مطلوب ہے[1]، اور دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر اس کا احترام اور اس کا پاس ادب ملحوظ و منظور ہے، اس کے لئے شریعت میں بڑے وسیع اور حکیمانہ انتظامات کئے گئے ہیں اور دوررس ہدایات واحکام دیے گئے ہیں[2]۔

---

[1] طبرانی کی روایت ہے "لا یؤمن احدکم حتی أکون أحب إلیہ من نفسہ الخ" تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کی اپنی ذات سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ صحیحین کی متعدد مشہور روایات میں باپ اولاد اور تمام انسانوں کا ذکر ہے۔

[2] مثلاً صحابہ کرام کو آپ کے سامنے زور سے بولنے، آواز پر آواز بلند کرنے کی ممانعت ہے، سورہ حجرات میں ہے "لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ" (اے ایمان والو۔۔۔! اپنی آوازیں پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو اس طرح ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو، اس پر یہ وعید سنائی گئی ہے کہ اس سے اندیشہ ہے کہ (باقی صفحہ ۱۵ پر)

یہ تغیر ایک بڑے خطرہ کی نشانی اور ایک بہت بڑے انقلاب اور بدقسمتی کی علامت ہے اور اس سے ہر اس حساس و دردمند مسلمان کو بے چین و مضطرب ہونا چاہیے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ عرب ہی اس دولت کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے امین و علمبردار تھے، اور عالم اسلام کے بقاء و استحکام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس قوت کا سرچشمہ اور اس دولت کے پاسبان و محافظ رہیں، اور ان سے عالم اسلام کو یہ فیض ملتا رہے۔

اس صورت حال سے متاثر ہو کر میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنی ان عربی تقریروں اور

(باقی ص۱۴ کا) تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور تم کو پتہ بھی نہ چلے گا (اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ)۔

اسی طرح آپ کو آواز دے کر حجرۂ مبارک سے بلانا اور چلا چلا کر آپ کو آواز دینا ایک نہایت مکروہ فعل اور گستاخی قرار دیا گیا ہے، اسی سورہ میں ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَاءِ الْحُجُرَاتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ" (جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں) عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنا اور آواز دینا بھی خلاف ادب اور نامناسب قرار دیا گیا، سورہ نور میں ہے "لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَاءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا" (مومنو! پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو)۔

اسی بنا پر آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواج مطہرات سے عقد کرنا ناجائز قرار دیا گیا کہ ایسی حالت میں دل میں وہ عظمت و لحاظ اور وہ ادب و احترام قائم نہیں رہ سکتا جو آپ کے ساتھ ضروری اور ایمان کی سلامتی کے لئے مفید و معاون ہے "وَمَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَا اَنْ تَنْکِحُوْا اَزْوَاجَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمًا" ——— (اور تم کو یہ شایاں نہیں کہ پیغمبر خدا کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے کبھی ان کے بعد نکاح کرو، یہ خدا کے نزدیک بڑے گناہ کا کام ہے۔

مضامین کو جو اپنے اپنے وقت پر مفید ثابت ہوئے تھے، اور عرب ادیبوں اور اہل ذوق نے ان سے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا تھا، یکجا جمع کر کے شائع کر دوں، شاید وہ کسی افسردہ اور سرد دل میں محبت کی نئی حرارت پیدا کرنے اور قوم پرستی کے اثر کو کم کرنے میں کوئی خدمت انجام دے سکے کہ ایک عجمی نژاد اور دور افتادہ کے اس سے زیادہ کچھ اور بس میں نہیں، نیز ان کے سامنے عجمی غلاموں کے عشق و محبت اور ان کی قلبی و روحانی وابستگی کے نمونے بھی پیش کئے جائیں جس سے ان کی عربی غیرت و عزت کو چوٹ لگے اور محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں متحرک اور مشتعل ہوں۔

مغربی علوم، مادی فلسفوں، جدید تعلیم، اور قوم پرستی کی رہنمائی میں جو غنیم فوجیں عجم کو چھوڑ کر اب خود عرب میں اور دور و دراز کے اسلامی ملکوں سے قطع نظر اب اندرون حرم میں داخل ہو گئی ہیں، ان کا مقابلہ کرنے اور ان کے اثرات کو زائل کرنے کی یہی صورت سمجھ میں آئی کہ اقلیم محبت، اور ولائت عشق کی طرف سے ایک نئی سپاہ تیار کی جائے جو مادیت کے ان لشکروں کے مقابلہ میں صف آرا ہو، خام عقل اور سطحی علم کا کامیابی کے ساتھ ہمیشہ محبت ہی نے مقابلہ کیا ہے، اور اس کے سوز و حرارت نے بے تعلقی اور بے کیفی ا[illegible] و خود غرضی کے جنگل کو جلا کر خاک کر دیا ہے، اقبالؔ نے معلوم ہوتا ہے خاص اسی موقع کے لئے کہا تھا۔

سپاہ تازہ برانگیزم از ولائت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

چنانچہ ۱۳۸۴ھ کے حج اور حاضری کے موقع پر یہ مجموعہ مرتب کر کے مدینۂ طیبہ کے ایک صاحبِ علم ناشر الشیخ محمد النمنکانی صاحب المکتبۃ العلمیۃ

کے حوالہ[1] کیا، اس کتاب کا نام مصنف نے "الطریق الی المدینہ" رکھا کہ اس سے اہل عرب کو مدینہ طیبہ اور اسلام کے آخری مرکز کی طرف از سر نو رہنمائی ہوتی ہے اور گویا اقبالؔ ہی کے الفاظ میں جدید تمدن کے پرستاروں اور قومیت کے دلدادہ عربوں کے لئے اپنے اصل مرکز کی طرف واپسی کی دعوت اور ان کے اس شعر کی تشریح و تصویر ہے ؎

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

مصنف نے اپنے فاضل دوست استاد علی طنطاوی سابق جج ہائی کورٹ شام سے جن کو وہ اس زمانہ میں عربی کا سب سے بڑا اہل قلم و ادیب سمجھتا ہے فرمائش کی کہ وہ کتاب پر پیش لفظ یا تعارف کے طور پر کچھ لکھ دیں، انھوں نے ازراہ کرم یہ فرمائش پوری کی اور اس طرح پوری کی کہ اس نے کتاب میں ایک وقیع اضافہ کر دیا اور کتاب و مصنف دونوں کی عزت بڑھائی۔

اب یہ سارا مجموعہ اردو میں منتقل کر کے شائع کیا جا رہا ہے کہ قوم پرستی کی تحریکیں مغربی تعلیم کے اثرات اور دور حاضر کی مادیت ہر جگہ اپنا اثر دکھا رہی ہیں اور دلوں کی اس گرمی اور اس سوز و گداز کو نقصان پہونچا رہی ہیں، جو اس امت کا بہت بڑا سرمایہ ہے اور مخالف اثرات کا مقابلہ کرنے کی اس کے اندر سب سے بڑی طاقت ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب اردو داں طبقہ کے لئے اسی طرح مفید اور آتش محبت کو

---

[1] یہ کتاب جمادی الاخری ۱۳۸۵ھ میں چھپ کر آگئی ہے۔

فروزاں کرنے میں انشاء اللہ اسی طرح مؤثر ہوگی، جس طرح اس کا عربی ایڈیشن، اردو میں مصنف نے اس کا نام "کاروانِ مدینہ" رکھا ہے۔

ابوالحسن علی
دائرہ شاہ علم اللہ

۲۸ رجمادی الاخری ۱۳۸۵ھ
۲۴ راکتوبر ۶۵ء بروز یکشنبہ

وہ کتاب جس کا احسان میں بھول نہیں سکتا

آج میں اس کتاب کا ذکر کروں گا، جس کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے اور میں اس کے صاحبِ دل اور عاشقِ رسول مصنف کے لئے خدا کے حضور دل سے دعا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی اس کتاب کے ذریعے مجھے ایک ایسی دولت سے آشنا کیا جو میرے نزدیک ایمان کے بعد سب سے قیمتی چیز بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایمان ہی کا ایک حصہ ہے، اس کتاب کا نام "رحمۃ للعالمین" ہے، اور اس کے مصنف مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ ہیں۔

اس کتاب کی ایک دلچسپ کہانی ہے:۔

میرے برادرِ معظم[۱] (جو میرے والد کی وفات کے بعد اس وقت سے میری تعلیم و تربیت کے ذمہ دار رہے جب میری عمر صرف نو سال کی تھی) اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اس کمسنی اور نوعمری میں کن کتابوں کا مطالعہ میرے لئے مفید ہوگا اور کتابوں کے انتخاب میں توفیقِ الٰہی برابر ان کا ساتھ دیتی، چنانچہ انھوں نے مجھے ایک کتاب "سیرت خیر البشر" پڑھنے کے لئے دی، ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں سیرت کی کتابوں کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کروں، ان کا عقیدہ تھا کہ کردار کی تعمیر، عقیدہ کی پختگی، اخلاق کی بالیدگی، اور ایمان کی تخم ریزی و پرورش کے لئے سیرت سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں، اسی لئے شروع ہی سے سیرت کی کتابوں سے مجھے ایک خاص لگاؤ اور

---

[۱] ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، سابق ناظم ندوۃ العلماء، (م ۲۸ر ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۱ء)

ان کے مطالعہ اور حصول کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

میں کتابوں کی فہرستوں کو جو مکتبے اکثر شائع کرتے رہتے ہیں، ہمیشہ بڑے شوق سے دیکھتا تھا، ایک مرتبہ میری نظر شبلی بکڈپو لکھنؤ کی فہرست کتب میں "رحمۃ للعالمین" پر پڑی، اور میں نے اس کتاب کا آرڈر بھجوادیا، اس وقت اس کتاب کے دو نسخے چھپے تھے، اور ایک بچے کا محدود بجٹ (جس کی عمر ۱۱ یا ۱۲ سال سے زیادہ نہ تھی) اس کتاب کو خریدنے سے یقیناً قاصر تھا، لیکن بچے بجٹ کے اصول و قواعد اور معاشیات کے ضوابط کے پابند نہیں ہوتے وہ صرف اپنی معصوم تمناؤں اور جذبات کے ساتھ چلتے ہیں۔

ایک روز ڈاکیہ ہمارے چھوٹے سے گاؤں (دائرہ شاہ علم اللہ" رائے بریلی) میں ڈاک لے کر آیا تو اس کے پاس اس کتاب کا پیکٹ بھی تھا، میں نے دیکھا کہ میرے پاس اس کتاب کو خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں، میری والدہ صاحبہ (اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے[1]) جن کو اپنے یتیم بچے کی خاطر عزیز تھی، نے بھی یہ رقم دینے سے معذرت کردی، اس لئے کہ اس وقت ان کے پاس کچھ نہ تھا، میں نے دیکھا کہ اس وقت میرا کوئی مددگار اور سفارشی نہیں ہے، سوائے اس سفارشی کے جس سے بچوں نے اکثر کام لیا ہے، اور ان کو اس کا تجربہ ہے کہ اس کی سفارش کبھی رد نہیں کی جاتی، یہ وہ سفارش ہے جس کی مدد سیدنا عُمیر بن ابی وقاصؓ نے لی تھی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی سفارش قبول فرمائی تھی، اور ان کو غزوۂ بدر میں شرکت کی اجازت دے دی تھی، یہ آنسوؤں اور معصوم گریہ و بکا کی سفارش ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے نیک بندوں کے یہاں اب بھی بہت وقیع ہے، اور ضرور سنی جاتی ہے۔

چنانچہ یہی ہوا، میری شفیق والدہ کا دل قدرتی طور پر نرم پڑ گیا، انھوں نے کہیں سے کوشش کرکے یہ رقم میرے حوالہ کی اور میں نے کتاب حاصل کرلی۔

اب میں نے کتاب پڑھنا شروع کیا، اور کتاب نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا، لیکن یہ کوئی تند و تیز ناگوار

---

[1] اس مضمون کی تحریر کے بعد ۶ جمادی الآخرہ ۱۳۸۶ھ میں انھوں نے انتقال فرمایا، والدہ مرحومہ خاص معمولات و کیفیات کی مالک تھیں، حافظ قرآن تھیں، شعر بھی کہتی تھیں، کئی مفید کتابیں اور دعا و مناجات کے پُراثر مجموعے ان کی یادگار ہیں۔

اور پریشان کن تحریک نہ تھی، یہ بہت نرم گداز اور روح پرور وجاں سوز تحریک تھی، میرا دل خوشی سے اس طرح جھوم اٹھا جیسے بادِ بہاری سے کوئی شاخ گل جھوم اٹھے اور پھولوں کے بوجھ سے لٹک جائے۔

یہ وہ فرق ہے جو عام فاتحین، نامور شخصیت کے حالاتِ زندگی، اور سیرت نبوی کی کتابوں میں آپ کو نظر آئے گا، وہ کتابیں بھی دل میں ایک حرکت، اضطراب اور تموج پیدا کرتی ہیں لیکن وہ اضطراب دل پر باہر سے حملہ آور ہوتا ہے، اور ناگوار اثر چھوڑتا ہے، اس کے برخلاف سیرت نبویؐ کی کتابوں سے دل میں جو حرکت پیدا ہوتی ہے، وہ خود قلبِ مومن سے اٹھتی ہے، اس کو آرام وراحت پہونچاتی ہے اور سکون و مسرّت سے ہم آغوش کرتی ہے۔

میرا دل اس کتاب کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہوگیا اور اس نے اس سے ایسا لطف لینا شروع کیا، جیسے وہ اسی کتاب کے انتظار میں تھا، میں نے اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ایک نئی اور عجیب لذت محسوس کی، یہ ان تمام لذتوں سے مختلف تھی، جن سے میں اپنی عمر کے اس دور میں (اس اضافہ کے ساتھ کہ میں شروع ہی سے بہت ذکی الحس واقع ہوا ہوں) آشنا تھا، یہ نہ بھوک کے وقت مزیدار کھانے کی لذت تھی، اور نہ عید کے دن نئے جوڑے کی، اور نہ شوق وولولہ کے ساتھ کھیل کود کی، نہ مسلسل محنت، پڑھائی، اور مشغولیت کے بعد چھٹی کی، نہ کسی مقابلہ یا میچ میں فتح کی، اور نہ کسی ہمدم دیرینہ اور مہمان عزیز کی ملاقات کی، یہ ان تمام مزوں اور لذتوں میں کسی لذت سے مشابہ نہ تھی، یہ ایک ایسی لذت تھی، جس کا مزہ تو میں جانتا تھا لیکن اس کو الفاظ میں ادا نہیں کرسکتا تھا، اور مجھے اعتراف ہے کہ اس کو متعین طور پر بیان کرنے اور ایک یا دو لفظوں میں اس کو ادا کرنے سے میں آج بھی قاصر ہوں، زیادہ سے زیادہ جو میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ روح کی لذت ہے، کیا بچے روح نہیں رکھتے اور ان کو روحانی لذت کا احساس نہیں ہوتا؟ نہیں، بخدا معصوم بچے بڑوں سے زیادہ لطیف روح کے مالک ہیں، اور زیادہ صحیح شعور رکھتے ہیں، خواہ وہ اس کو بیان نہ کرسکیں۔

میں اس سرور انگیز اور وجد آفریں کتاب میں جب قریش کے ان لوگوں کے واقعات پڑھتا تھا،

جو اسلام لائے تھے، اور اس کے نتیجہ میں ان کو سخت سے سخت اذیتیں دی جاتی تھیں، اور وہ ان کو صبر و استقامت بلکہ لذت و مسرت کے ساتھ برداشت کرتے تھے، تو اس وقت میں محسوس کرتا تھا کہ یہاں ایک لذت اور بھی ہے، جس سے امرا و اغنیا اور وہ لوگ جن کو دنیا والے خوش نصیب و اقبال مند سمجھتے ہیں، بالکل ناواقف ہیں، اور وہ یہ ہے کہ آپ کو راہِ حق میں کوئی تکلیف اٹھانی پڑے، عقیدہ کی خاطر ظلم برداشت کرنا پڑے اور دعوتِ دین کے راستہ میں آپ کو ذلیل کیا جائے، یہ وہ لذت ہے کہ فتح و کامرانی، اور عروج و اقبال اور جاہ و اقتدار کی کوئی لذت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، میں نے دیکھا کہ میرا دل اس بات کا متمنی ہے کہ اس کو یہ لذت، عزت اور سعادت نصیب ہو خواہ پوری عمر میں ایک ہی بار سہی۔

میں نے مصعب بن عمیرؓ کا واقعہ پڑھا، وہ مصعب بن عمیرؓ جو خوش ذوقی، جامہ زیبی، نفاستِ طبع اور معیارِ زندگی کی بلندی میں ضرب المثل تھے، قریش کے ناز پروردہ اور عیش و تجمل کے دلدادہ نوجوان، مکہ میں سیر کے لئے نکلتے تو جسم پر سو سو درہم کی پوشاک ہوتی، اور سارے شہر میں اس کا چرچا ہو جاتا تھا، لیکن انھوں نے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تو دولت مندی کے ان سارے مظاہر سے ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے، اب وہ موٹا جھوٹا کپڑا پہنتے، اور سادہ زندگی گذارتے اور بعض وقت اپنی چادر کو ببول کے کانٹے سے اٹکانے پر مجبور ہوتے، یہ منظر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو آبدیدہ کر دیتا، اور آپؐ کو یاد آتا کہ پہلے ان کی زندگی کتنی آرام دہ اور پرتکلف تھی، یہ نوجوان جب غزوۂ احد میں شہید ہوا تو اس کے بدن پر صرف ایک چادر تھی، اور وہ بھی اتنی مختصر کہ اگر پیروں پر ڈالی جاتی تو سر کھل جاتا اور سر اوڑھایا جاتا تو پیر کھل جاتے، اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کا سر ڈھک دو اور پیروں پر اذخر (گھاس) ڈال دو، میں نے یہ قصہ پڑھا تو اس نے مجھے اپنا اسیر دام اور گرویدہ بنا لیا، اور میرے دل و دماغ پر پورا قبضہ کرلیا، اس قصے سے مجھے اندازہ ہوا کہ پرتکلف اور ناز و نعم کی زندگی، بیش قیمت پوشاک، لذیذ و نفیس کھانے اور عالی شان محل کے ماسوا، انسان کی ایک اور ضرورت بھی ہے، جہاں تک ان دولت مندوں اور بادشاہوں کی رسائی

نہیں ایک ایسی لذت بھی ہے جس سے یہ معدہ کے پرستار اور خواہشات کے گرفتار نا آشنا ہیں، میں نے اپنے دل کو دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کو اس ضرورت اور لذت کی آرزو اور جستجو ہے، اور اس کی نگاہ میں اس بلند اور اعلیٰ حقیقت کی جتنی قدر اور عزت ہے، امراء و اغنیاء کی زرق برق پوشاکوں کھوکھلے مظاہروں اور بے روح نمائش کی نہیں

میں نے اس میں ہجرت نبوی کا قصہ بھی پڑھا، وہ قصہ جس سے زیادہ مؤثر اور جاندار قصہ میں نے نہیں پڑھا اور جس کو مصنف نے اپنی کتاب میں بڑی سادگی اور سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے ــــ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لاتے ہیں، تمام لوگوں کے دل و نگاہ آپ کے لئے چشم براہ بلکہ فرش راہ ہیں، ایک ایک قبیلہ آپ کے پاس حاضر ہوتا ہے، اور پورے خلوص اور سادگی کے ساتھ رکاب تھام کر عرض کرتا ہے، حضورؐ آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں، سب کچھ آپ پر نثار ہے، آپؐ (فداہ ابی و امی) ارشاد فرماتے ہیں، یہ اونٹنی اللہ کی طرف سے مامور ہے، اس کو راستہ دیدو، پھر یہ اس جگہ ٹھہرتی ہے جہاں آج مسجد نبوی کا دروازہ ہے، اور اٹھنے سے انکار کر دیتی ہے، اور مشیت الٰہی کا فیصلہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ شرف حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو حاصل ہو، ابو ایوب انصاریؓ اپنے محبوب مہمان کو بصد احترام گھر لاتے ہیں اور سامان اترواتے ہیں۔

میں اس عزت پر ابو ایوب انصاریؓ کی مسرت کو پڑھ سکتا تھا جو تقدیر نے ان کے دروازہ تک پہونچا دی تھی، اور دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس مسرت اور گرمجوشی کے ساتھ آپ کی ضیافت کر رہے ہیں۔

میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرا دل مجھے چھوڑ کر اب ناقۂ نبوی کے ساتھ ساتھ ہے، اور اسی کی ہمرکابی میں مدینہ پہونچا ہے، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کہ یہ دلکش سماں میں اپنی ان آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، فاتحین و سلاطین اور تاریخ کے نامور قائدین کے فاتحانہ داخلے جاہ و حشم کے مظاہرے، اور چوبداروں کے نقارے مجھے اس وقت بالکل ہیچ اور ناقابل ذکر معلوم ہونے لگے، کسی انسان سے کسی انسان کی محبت و وفاداری کا یہ منظر میرے دل میں اور میرے حافظہ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گیا۔

میں نے اُحد کا قصہ بھی پڑھا، یہ اخلاص و وفا، قربانی و ایثار، ایمان و یقین، شرافت و حوصلہ مندی

کی ایک ایسی کہانی ہے جس سے زیادہ عظیم وجلیل اور حسین وجمیل کہانی تاریخ میں کسی اور جگہ نظر نہ آئے گی، جب انس بن النضرؓ نے یہ دیکھ کر کہ لوگوں نے اپنے ہاتھ پیر چھوڑ دیئے ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، یہ تاریخی جملہ کہا، "جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جان دی ہے تم بھی اسی پر جان دے دو" اور کسی نے یہ کہا کہ "مجھے احد کے اس پار سے جنت کی خوشبو آ رہی ہے" جن کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسوں میں کسی طرح حضورؐ کی خدمت میں پہونچ جائیں، جب ان کو اٹھا کر وہاں لے جایا گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر انھوں نے جان دے دی۔

ابو دُجانہؓ نے کسی طرح حضورؐ کو بچانے کے لئے اپنے کو ڈھال بنا لیا تھا، اور سارے تیر ان کی پیٹھ پر گر رہے تھے، اور وہ آپ پر جھکے ہوئے تھے، اس طرح محبت وجانثاری کے اور واقعات یکے بعد دیگرے میرے سامنے آتے گئے، کبھی میرا دل بھر آتا اور میں بے ساختہ رو دیتا، کبھی سرور و مستی میں جھوم جھوم اٹھتا۔

اس کتاب کا اور اس کے مخلص مصنف کا وہ احسان جو میں کبھی نہ بھولوں گا یہ ہے کہ اس نے میرے دل میں اس خوابیدہ ومخفی محبت کو ابھارا ہے، جس کے بغیر زندگی میں کوئی مزہ نہیں، اور جس کے بغیر اس زندگی کی کوئی قیمت بھی نہیں، کسی فارسی شاعر نے شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا ؎

ناخوش آں وقتے کہ بر زندہ دلاں بے عشق رفت
ضائع آں روزے کہ بر مستاں بہ ہشیاری گذشت

یہی دیوانگی محبت تو زندگی کا حاصل اور مغز ہے، فارسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

در خرمن کائنات کردیم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

یہی وہ محبت ہے جس کی وجہ سے یہ عبقری وذہین انسان ہمیں انسانی صفوں میں اور اپنے ہم چشموں اور رفیقوں میں بہت بلند وبالا نظر آتے ہیں، یہی وہ "اکسیر اعظم" ہے، جس کی وجہ سے معمولی اور عام سطح

کے لوگوں نے ایسے ایسے کام کئے اور اتنی بڑی خدمت انجام دی جو بڑے طاقت ور، دولت مند اور ذی حیثیت لوگ نہ کر سکے، اس کی وجہ سے ایک شخص نے بڑی بڑی قوموں پر غلبہ حاصل کیا، کسی ایک قوم نے جب اس نسخہ کو استعمال کیا تو پوری دنیا اس کے قدموں پر گر گئی۔

یہ وہ محبت ہے جس میں آج یہ اُمت بہت مفلس اور تہی دامن ہو چکی ہے آج اس کے پاس بڑی دولت ہے، بڑا وسیع اور متنوع علم ہے، جاہ و منصب ہے، اور بہت سے ملکوں کی زمامِ اقتدار اس کے ہاتھوں میں ہے، لیکن وہ زندگی کے اس "آبِ حیات" سے محروم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک بے جان لاشہ ہو کر رہ گئی ہے جس کو زندگی اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرتی ہے۔

یہ وہ سرچشمۂ محبت ہے، جس سے سب سے زیادہ محروم ہمارا جدید تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ طبقہ ہے، اور اس محرومی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اس کی روح سب سے زیادہ بے سرور و بے کیف ہے، اس کے مادّیت کی دل فریبیوں کے اندر مقابلہ کی طاقت سب سے کم ہے، وہ ملّت کے دوسرے طبقوں سے زیادہ بے اثر اور بے وزن ہے، اس کی زندگی سب سے زیادہ مکدر و بے لطف اور اس کی کوششیں سب سے زیادہ بے مقصد اور رائیگاں ہیں۔

اس کتاب کا اور صاحبِ کتاب کا میں دل سے شکر گذار ہوں اس لئے کہ اس نے میری محبت کے پرسکون ساز کو چھیڑ دیا اور اس بات کا بھی شکر گذار ہوں کہ اس نے اس اُبھرتی ہوئی متحرک اور زندہ و بیدار محبت کا رخ اس شخصیت کی طرف پھیر دیا جس سے زیادہ اس محبت کا کوئی اور حقدار نہیں، جو اس کائنات میں حسن و احسان اور جمال و کمال کا سب سے بڑا پیکر ہے، اور جس سے زیادہ صورت و سیرت اور کمالِ ظاہر و باطن کا دلکش انسانی نمونہ خالق و مالک، اور قادرِ مطلق نے کوئی اور نہیں بنایا۔ (صلے اللہ علیہ وسلم)

اس امت کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس نے دل سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے اور محبت

کی لذت سے محروم ہے، اقبالؔ نے بالکل صحیح کہا ہے ؎

شبے پیشِ خدا بگریستم زار　　　مسلمانان چرا زارند و خوارند

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم　　　دلے دارند و محبوبے ندارند

خدا کی سلامتی ہو آپ پر اے سلیمان! مجھے آپ کی کتاب سے وہ ؓ ایسی نعمتیں حاصل ہوئیں کہ اسلام کے بعد ان سے بڑی کوئی اور نعمت نہیں۔

ایک محبت کی نعمت، دوسرے اس کے صحیح محل اور مصرف کی نعمت ــــ اور واقعی یہ نعمت کتنی بڑی ہے!![1]

---

[1] "الطریق إلی المدینۃ" ترجمہ مولوی سید محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی (عربی)

عَالمِ نَو

یوں تو اس دنیا کی عمر بہت بتلائی جاتی ہے مگر یہ دنیا کئی بار سو سو کر جاگی ہے، اور مر مر کر زندہ ہوئی ہے، آخری بار جب یہ موت کی نیند سے بیدار ہوئی، اور اس نے عقل و ہوش کی آنکھیں کھولیں، وہ، وہ دن تھا جب مکہ کے سردار عبد المطلب کے گھر پوتا پیدا ہوا، وہ پیدا ہوا تو یتیم تھا، مگر اس نے پوری انسانیت کی سرپرستی کی اور دنیا کو نئی زندگی بخشی، سوتے میں جو عمر کٹی وہ کیا عمر ہے؟ خودکشی میں جو وقت گزرا، وہ کیا زندگی ہے؟ اس لئے سچ پوچھئے تو موجودہ دنیا کی کام کی عمر چودہ سو برس سے زائد نہیں۔

چھٹی صدی مسیحی میں انسانیت کی گاڑی ایک ڈھلوان راستے پر پڑ گئی تھی، اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا، راستے کا نشیب بڑھتا جا رہا تھا، اور رفتار تیز ہوتی جارہی تھی، اس گاڑی پر انسانیت کا پورا قافلہ اور آدم کا سارا کنبہ سوار تھا، ہزاروں برس کی تہذیبیں، اور لاکھوں انسانوں کی محنتیں تھیں، گاڑی کے سوار میٹھی نیند سو رہے تھے، یا زیادہ اور اچھی جگہ حاصل کرنے کے لئے آپس میں دست و گریباں تھے، کچھ تنک مزاج تھے، جو جب ساتھیوں سے روٹھتے تو ایک طرف سے دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ جاتے، کچھ ایسے جو اپنے جیسے لوگوں پر حکم چلاتے، کچھ کھانے پکانے میں مشغول تھے، کچھ گانے بجانے میں مصروف، مگر کوئی یہ نہ دیکھتا کہ گاڑی کس غار کی طرف جارہی ہے، اور اب وہ کتنا قریب رہ گیا ہے۔

انسانیت کا جسم تر و تازہ تھا، مگر دل نڈھال، دماغ تھکا ہوا، ضمیر بے حس و مردہ، نبضیں

ڈوب رہی تھیں، اور آنکھیں پتھرانے والی تھیں، ایمان ویقین کی دولت سے عرصہ ہوا یہ انسانیت محروم ہو چکی تھی، پورے پورے ملک میں ڈھونڈنے سے ایک صاحب یقین نہ ملتا تو ہمات کا ساری دنیا پر قبضہ تھا، انسانیت نے اپنے کو خود ذلیل کیا تھا، انسان نے اپنے غلاموں اور چاکروں کے سامنے سر جھکایا تھا، ایک خدا کے سوا سب کے سامنے اس کو جھکنا منظور تھا، حرام اس کے منہ کو لگ گیا تھا ؎

شراب اس کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
جُوا اس کی دن رات کی دل لگی تھی

بادشاہ دوسروں کے خون پر پلتے تھے، اور بستیاں اجاڑ کر بستے تھے، ان کے کتے موج کرتے اور انسان دانہ دانہ کو ترستے، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ جینا دوبھر تھا، جو اس معیار پر پورا نہ اترے وہ جانور سمجھا جاتا تھا، نئے نئے ٹیکسوں سے کسانوں اور دستکاروں کی کمر جھکی اور کمر ٹوٹی جاتی تھی، لڑائی اور بات کی بات میں ملکوں کی صفائی اور قوموں کی تباہی ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، سب زندگی کی فکروں میں گرفتار اور ظلم و زیادتی سے زار و نزار تھے، پورے پورے ملک میں ایک اللہ کا بندہ ایسا نہ ملتا جس کو اپنے پیدا کرنے والے کی رضامندی کی فکر ہو، یا راستے کی سچی تلاش ہو، غرض یہ نام کی زندگی تھی مگر حقیقت میں ایک وسیع اور طویل خودکشی۔

دنیا کی اصلاح انسانوں کے بس سے باہر تھی، پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا معاملہ ایک ملک کی آزادی اور ایک قوم کی ترقی کا نہ تھا معاملہ پوری انسانیت کی موت اور زندگی کا تھا سوال کسی ایک خرابی کا نہ تھا انسانیت کا بدن داغ داغ تھا، دامن تار تار! اصلاح کے لئے جو لوگ آگے بڑھے وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گئے۔ ؏

"تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا"

فلسفی اور حکیم، شاعر اور ادیب، کوئی اس میدان کا مرد نہ نکلا، سب اس وبا کے شکار تھے، مریض مریض کا علاج کس طرح کرے؟ جو خود یقین سے خالی ہو، وہ دوسروں کو کس طرح یقین سے بھر دے؟ جو خود پیاسا ہو، دوسرے کی پیاس کس طرح بجھائے؟ انسانیت کی قسمت پر بھاری قفل پڑا تھا اور

کنجی گم تھی، زندگی کی ڈور اُلجھ گئی تھی اور سرا نہ ملتا تھا!

اس دنیا کے مالک کو اپنے گھر کا یہ نقشہ پسند نہ تھا، آخر کار اس نے عرب کی آزاد اور سادہ قوم میں جو فطرت سے قریب تھی، ایک پیغمبر بھیجا کہ پیغمبر کے سوا اب اس بگڑی دنیا کو کوئی بنا نہیں سکتا تھا، اس پیغمبر کا نام نامی محمّد بن عبداللہ ہے، اللہ کے لاکھوں سلام و درود ہوں ان پر ؂

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

اس زندگی کی ہر چیز سلامت تھی مگر بے جگہ بے قرینہ، زندگی کا پہیہ گھوم رہا تھا، مگر غلط رخ پر، اصل خرابی یہ تھی کہ زندگی کی چول کھسک گئی تھی، اور ساری خرابی اسی کی تھی، یہ چول کیا تھی؟ اپنے اور اس دنیا کے بنانے والے کا صحیح علم، اسی کی بندگی اور تابعداری کا فیصلہ، اس کے پیغمبروں کو ماننا اور ان کی ہدایت و تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنا، اور دوسری زندگی کا یقین۔

انھوں نے اس زندگی کی چول بٹھا دی، مگر اپنی زندگی اور اپنے خاندان کی زندگی کو خطرے میں ڈال کر، اور اپنا سب کچھ قربان کر کے، انھوں نے اس مقصد کی خاطر بادشاہی کا تاج ٹھکرا دیا، دولت اور عیش کی بڑی سے بڑی پیش کش کو نامنظور کیا، محبوب وطن کو چھوڑا، ساری عمر بے آرام رہے، پیٹ پر پتھر باندھے، کبھی پیٹ بھر کھانا نہ کھایا، گھر والوں کو فقر و فاقہ میں شریک رکھا، دنیا کی ہر قربانی میں، ہر خطرے میں پیش پیش، اور ہر فائدہ اور ہر لذت سے دُور دُور، لیکن دنیا سے اس وقت تک تشریف نہ لے گئے جب تک کہ دنیا کو صحیح رخ پر نہ ڈال دیا، اور تاریخ کا دھارا نہ بدل دیا۔

تئیس ۲۳ برس میں دنیا کا رخ پلٹ گیا، دنیا کا ضمیر جاگ گیا، نیکی کا رجحان پیدا ہو گیا، اچھے بُرے کی تمیز ہونے لگی، خدا کی بندگی کا راستہ کھل گیا، انسان کو انسان کے سامنے اور اپنے خادموں کے سامنے جھکنے میں شرم محسوس ہونے لگی، اونچ نیچ دور ہوئی، قومی و نسلی غرور ٹوٹا، عورتوں کو حقوق ملے،

کمزوروں و بے بسوں کی ڈھارس بندھی، غرض دیکھتے دیکھتے دنیا بدل گئی جہاں پورے پورے ملک میں ایک خدا سے ڈرنے والا نظر نہ آتا، وہاں لاکھوں کی تعداد میں ایسے انسان پیدا ہو گئے، جو اندھیرے اجالے میں خدا سے ڈرنے والے تھے، جو یقین کی دولت سے مالا مال تھے جو دشمن کے ساتھ انصاف کرتے تھے جو حق کے معاملے میں اپنی اولاد کی پرواہ نہ کرتے، جو اپنے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار رہتے، جو دوسروں کے آرام کی خاطر مصیبت برداشت کرتے، جو کمزور کو طاقتور پر ترجیح دیتے، رات کے عبادت گزار، دن کے شہسوار، دولت، حکومت، طاقت، خواہشات، سب پر حاکم، سب پر غالب، صرف ایک اللہ کے محکوم، صرف ایک اللہ کے غلام، انھوں نے اس دنیا کو علم، یقین، امن، تہذیب، روحانیت اور خدا کے ذکر سے بھر دیا۔

زمانے کی رُت بدل گئی، انسان کیا بدلا، جہاں بدل گیا، زمین و آسمان بدل گئے، یہ سارا انقلاب اسی پیغمبرؐ کی کوشش اور تعلیم کا نتیجہ ہے، آدمؑ کی اولاد پر آدمؑ کے کسی فرزند کا اتنا احسان نہیں، جیسا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے انسانوں پر ہے، اگر اس دنیا سے وہ سب لے لیا جائے جو محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس کو عطا کیا ہے تو انسانی تہذیب ہزاروں برس پیچھے چلی جائے گی اور اس کو اپنی زندگی کی عزیز ترین چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا۔

رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش کا دن مبارک کیوں نہ ہو کہ اس دن دنیا کا سب سے مبارک انسان پیدا ہوا جس نے اس دنیا کو نیا ایمان اور نئی زندگی عطا کی ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
وہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے [1]

---

[1] ربیع الاول کے پروگرام میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی۔

صُورِ زندگی

ذرا چودہ سو برس پہلے کی دنیا پر نظر ڈالئے، اونچی اونچی عمارتوں، سونے چاندی کے ڈھیروں اور زرق برق لباسوں کو چھوڑ دیجئے، یہ تو آپ کو پرانی تصویروں کے مرقع اور مردہ عجائب خانہ میں بھی نظر آجائیں گے، یہ دیکھئے کہ انسانیت بھی کبھی جیتی جاگتی تھی، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھر کر دیکھ لیجئے اور سانس روک کر آہٹ لیجئے، کہیں اس کی نبض چلتی ہوئی اور اس کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے؟

زندگی کے سمندر میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھائے جارہی تھی، انسانیت کے جنگل میں شیر اور چیتے سور اور بھیڑیے بکریوں اور بھیڑوں کو کھا رہے تھے، بدی نیکی پر، رذالت شرافت پر، خواہشات عقل پر، پیٹ کے تقاضے روح کے تقاضوں پر غالب آچکے تھے، لیکن اس صورت حال کے خلاف اتنی لمبی چوڑی زمین پر کہیں احتجاج نہ تھا، انسانیت کی چوڑی پیشانی پر غصہ کی کوئی شکن نظر نہیں آتی تھی، ساری دنیا نیلام کی ایک منڈی بن چکی تھی، بادشاہ و وزیر، امیر و غریب، اس منڈی میں سب کے دام لگ رہے تھے اور سب کوڑیوں میں بک رہے تھے، کوئی ایسا نہ تھا، جس کا جوہر انسانیت خریداروں کے حوصلہ سے بلند ہو اور جو پکار کر کہے کہ یہ ساری فضا میری ایک اڑان کے لئے کافی نہیں، یہ ساری دنیا اور یہ پوری زندگی میرے حوصلہ سے کم تھی، اس لئے ایک دوسری ابدی زندگی میرے لئے پیدا کی گئی، میں اس فانی زندگی اور اس محدود دنیا کی ایک چھوٹی سی کسر پر اپنی روح کو کس طرح فروخت کر سکتا ہوں۔؟

قوموں اور ملکوں کے اوران سے گزر کر قبیلوں اور برادریوں کے اوران سے آگے بڑھ کر کنبوں اور گھرانوں کے، چھوٹے سے چھوٹے گھروندے بن گئے تھے، اور بڑے بڑے بلند ہمت انسان جن کو اپنی سرفرازی اور سربلندی کے بڑے اونچے دعوے تھے، بالشتیوں کی طرح ان گھروندوں میں رہنے کے عادی بن چکے تھے، کسی کو ان میں تنگی اور گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی، اور کسی کو اس سے زیادہ وسیع تر انسانیت کا تصور باقی نہیں رہا تھا، زندگی ساری سود و سودا اور مکر و فن میں گھر کر رہ گئی تھی۔

انسانیت ایک سرد لاشہ تھا جس میں کہیں روح کی تپش، دل کا سوز اور عشق کی حرارت باقی نہیں رہی تھی، انسانیت کی سطح پر خودرو جنگل اُگ آیا تھا، ہر طرف جھاڑیاں تھیں جن میں خونخوار درندے اور زہریلے کیڑے تھے، یا دلدلیں تھیں، جن میں جسم سے لپٹ جانے والی اور خون چوسنے والی جونکیں تھیں، اس جنگل میں ہر طرح کا خوفناک جانور، ہر طرح کا شکاری پرندہ، اوران دلدلوں میں ہر قسم کی جونک پائی جاتی تھی، لیکن آدم زادوں کی اس بستی میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، جو آدمی تھے وہ غاروں کے اندر، پہاڑوں کے اوپر اور خانقاہوں اور عبادت گاہوں کی خلوتوں میں چھپے ہوئے تھے اور اپنی خیر منا رہے تھے یا زندگی میں رہتے ہوئے زندگی سے آنکھیں بند کرکے فلسفہ سے اپنا دل بہلا رہے تھے یا شاعری سے اپنا غم غلط کر رہے تھے اور زندگی کے میدان میں کوئی مرد میدان نہ تھا۔

دفعتاً انسانیت کے اس سرد جسم میں گرم خون کی ایک رو دوڑی، نبض میں حرکت اور جسم میں جنبش پیدا ہوئی، جن پرندوں نے اس کو مردہ سمجھ کر اس بے حس جسم کی ساکن سطح پر بسیرا کر رکھا تھا ان کو اپنے گھر ہلتے ہوئے اور اپنے جسم لرزتے ہوئے محسوس ہوئے، قدیم سیرت نگار اس کو اپنی زبان خاص میں یوں بیان کرتے ہیں کہ کسریٰ شاہ ایران کے محل کے کنگرے گرے اور آتش پارس ایک دم بجھ گئی، زمانۂ حال کا مورخ اس کو اس طرح بیان کرے گا کہ انسانیت کی اس اندرونی حرکت سے اس کی بیرونی سطح میں اضطراب پیدا ہوا، اس کی اس ساکن و بے حرکت سطح پر جتنے کمزور اور بودے قلعے بنے ہوئے تھے،

ان میں زلزلہ آیا، مکڑی کا ہر جالا ٹوٹتا اور تنکوں کا ہر گھونسلہ بکھرتا نظر آیا، زمین کی اندرونی حرکت سے اگر سنگین عمارتیں اور آہنی بیج خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ سکتے ہیں تو پیغمبر کی آمد آمد سے کسریٰ و قیصر کے خود ساختہ نظاموں میں تزلزل کیوں نہ ہوگا؟ زندگی کا یہ گرم خون جو انسانیت کے سرد جسم میں دوڑا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا واقعہ ہے جو متمدن دنیا کے قلب مکہ معظمہ میں پیش آیا۔

آپ نے دنیا کو جو پیغام دیا اس کے مختصر لفظ زندگی کی تمام وسعتوں پر حاوی ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ انسانی زندگی کی جڑیں اور اس کے چھوٹے قصر زندگی کی بنیادیں کبھی اس زور سے نہیں ہلائی گئیں جیسی اس پیغام لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے اعلان سے ہلائی گئیں اور دنیا کے کند ذہن پر کبھی ایسی چوٹ نہیں پڑی تھی جیسے ان لفظوں سے پڑی، وہ غصہ سے تلملا گیا اور اس نے جھنجھلا کر کہا "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ" (کیا ان سب کو جن کی ہم پرستش کرتے تھے اور جن کے ہم بندے بنے ہوئے تھے اُڑا کر ایک ہی معبود مقصود رکھا ہے؟ یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے) اس ذہن کے نمائندوں نے فیصلہ کیا کہ یہ ہمارے نظام زندگی کے خلاف ایک گہری اور منظم سازش ہے اور ہم کو اس کا مقابلہ کرنا ہے "وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ" (ان کے سردار اور ذمہ دار ایک دوسرے کے پاس گئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، یہ تو کوئی طے کی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔)

یہ نعرہ زندگی اور انسانیت کے پورے تصور پر ایک کاری ضرب تھی، جو ذہن کے پورے سانچے اور زندگی کے پورے ڈھانچے کو متاثر کرتی تھی اس کا مطلب تھا جیسا کہ آج تک سمجھا جاتا رہا یہ دنیا کوئی خودرو جنگل نہیں بلکہ یہ مالی کا لگایا ہوا آراستہ باغ ہے اور انسان اس باغ کا سب سے اعلیٰ پھول ہے یہ پھول جو ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے بے مقصد نہیں کہ مَل دَل کر رہ جائے، انسان کے جوہر انسانیت کی اس خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا، اس کے اندر وہ لامحدود طلب، وہ بلند ہمت، وہ بلند پرواز روح

اور وہ مضطرب دل ہے کہ ساری دنیا مل کر اس کی تسکین نہیں کر سکتی اور یہ سست عناصر دنیا اس کے ساتھ نہیں چل سکتی، اس کے لئے غیر فانی زندگی اور ایک لامحدود دنیا درکار ہے جس کے سامنے یہ زندگی ایک قطرہ اور یہ دنیا بازیچۂ اطفال ہے، وہاں کی راحت کے سامنے یہاں کی راحت اور وہاں کی تکلیف کے سامنے یہاں کی کوئی تکلیف حقیقت نہیں رکھتی اس لئے انسان کا فطری تقاضا خدائے واحد کی عبادت، اس کی خود شناسی رضائے الٰہی کی طلب اور اس کی زندگی اس کے لئے جدوجہد ہے، انسان کو کسی روح، کسی مخفی و فرضی طاقت کسی درخت اور پتھر، کسی قسم کی دھات اور جمادات، کسی مال و دولت، کسی جاہ و عزت، کسی طاقت و قوت اور کسی روحانیت و عظمت کے سامنے بندوں کی طرح جھکنے اور سبزہ کی طرح پامال ہونے کی ضرورت نہیں، وہ صرف ایک بلندی کے سامنے سب سے زیادہ پست اور سب پستیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بلند ہے، وہ سارے عالم کا مخدوم اور ایک ذات کا خادم ہے، اس کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرا کر اور اس کو اللہ کے سوا ہر ایک کے سجدہ سے منع کر کے ثابت کر دیا کہ کائنات کی طاقتیں جن کے فرشتے امین ہیں، اس کے سامنے سرنگوں اور سربسجود ہیں اور اس کا سر اس کے جواب میں اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے۔

دنیا کا ذہن اتنا شل ہو چکا تھا کہ وہ مادیت و محسوسات اور جسم اور پیٹ کے حدود سے باہر آسانی سے کام نہیں کر سکتا تھا، لوگوں کا ذہن اتنا تھلا ہو چکا تھا کہ وہ کسی انسان سے متعلق گہرا اور بلند تصور قائم ہی نہیں کر سکتا تھا، انھوں نے کچھ پیمانے بنا رکھے تھے، ہر نئے شخص کو اس پیمانے سے ناپتے تھے، زندگی کی جو چھوٹی چھوٹی بلندیاں بن چکی تھیں، ہر بلند انسان کو انھیں کے سامنے لاکر دیکھتے تھے، انھوں نے بڑے غور و فکر اور ذہانت سے کام لیا اور وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کے آگے نہ سوچ سکے کہ یا تو وہ مال و دولت کے یا سرمایہ داری و بادشاہی کے یا عیش و عشرت کے طالب ہیں، انصاف کیجئے تو اس وقت تک دنیا کا تجربہ اس سے زیادہ اور کیا تھا اور اس نے اپنے زمانہ کے حوصلہ مندوں اور شہبازوں کی اس سے بلند پرواز کب دیکھی تھی؟ انھوں نے آپ کی خدمت میں

ایک وفد بھیجا، یہ دراصل اس عصر کے ذہن و دماغ اور نفسیات کی سچی نمائندگی اور اس نے جو کچھ کہا وہ زمانہ کے احساسات کی صحیح ترجمانی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اس کا جواب دیا وہ نبوت کی صحیح نمائندگی اور امت مسلمہ کی حقیقت کا اصلی اظہار تھا، آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ ان میں سے کسی چیز کے طالب نہیں، آپ جس چیز کے داعی ہیں وہ ان کی ان بلند چیزوں سے اس سے بھی زیادہ اونچی ہے، جتنا آسمان اس زمین سے، آپ اپنی ذاتی راحت اور ترقی کے لئے فکرمند نہیں بلکہ نوع انسانی کی نجات اور اس کی راحت کے لئے بے چین ہیں، آپ اس دنیا میں اپنے لئے کوئی مصنوعی جنت بنانے کے خواہشمند نہیں بلکہ جنت سے نکالے ہوئے انسان کو حقیقی جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل کرنا چاہتے ہیں، آپ اپنی سرداری کے لئے کوشاں نہیں بلکہ تمام انسانوں کو انسان کی غلامی سے نکال کر بادشاہ حقیقی کی غلامی میں داخل کرنا چاہتے ہیں، اسی بنیاد پر یہ اُمت بنی اور یہی پیغام لے کر تمام دنیا میں پھیل گئی، اس کے سفیروں نے جو اپنے اندر دعوت کی سچی روح اور اسلام کی صحیح زندگی رکھتے تھے کسریٰ اور قیصر کے بھرے دربار میں صاف کہہ دیا کہ ہم کو اللہ نے اس کام کے لئے مقرر کیا ہے کہ ہم اس کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت میں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے انصاف میں داخل کریں، ان کو جب اپنے اصولوں پر حکومت قائم کرنے اور چلانے کا موقع ملا تو وہ جو کچھ کہتے تھے، اور جس کی دوسروں کو دعوت دیتے تھے اس کو جاری کر کے دکھا دیا، اُن کی معیاری حکومت کے زمانہ میں کسی انسان کی بندگی نہیں ہوتی تھی بلکہ اللہ کی بندگی ہوتی تھی، کسی انسان یا جماعت کا حکم نہیں چلتا تھا، بلکہ اللہ کا حکم چلتا تھا، ان کا حاکم جس کو وہ خلیفہ کہتے تھے، معمولی سی انسانی تحقیر پر کہہ اُٹھتا تھا کہ لوگ ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے، تم نے ان کو کب سے غلام بنا لیا؟ ان کا بڑے سے بڑا حاکم بڑی بڑی بادشاہتوں کے دارالسلطنت میں اس شان سے رہتا تھا کہ لوگ اس کو مزدور سمجھ کر اس کے سر پر بوجھ رکھ دیتے تھے، اور وہ اس کو ان کے گھر پہونچا آتا

تھا، ان کا دولت مند انسان اس طرح زندگی گزارتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زندگی کو زندگی اور اس کی راحت کو راحت ہی نہیں سمجھتا اس کی نظر کسی اور زندگی پر ہے، اور اس کو طلب کسی اور راحت کی ہے۔

اس امت کا وجود دنیا کے ہر گوشہ میں مادی حقیقتوں اور جسمانی لذتوں کے علاوہ ایک بالکل دوسری حقیقت کے وجود کا اعلان ہے اس کا ہر فرد پیدا ہو کر اور مر کر بھی اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ دنیا کی طاقتوں سے بڑی ایک دوسری طاقت ہے اور اس زندگی سے زیادہ حقیقی دوسری زندگی ہے، وہ دنیا میں آتا ہے تو اس کے کان میں اسی حق کی اذان دی جاتی ہے، مرتا ہے تو اسی شہادت و مظاہرہ کے ساتھ اس کو رخصت کیا جاتا ہے، جب اس دنیا پر بے حسی اور موت کا سکوت طاری ہو جاتا ہے اور شہر کی ساری آبادی معاش کی جدوجہد میں سرتاپا غرق ہو جاتی ہے اور دنیا میں مادی ضرورتوں کے علاوہ کوئی اور ضرورت اور محسوس حقیقتوں کے علاوہ کوئی اور حقیقت جیتی جاگتی نظر نہیں آتی، اس کی وہی اذان اس طلسم کو توڑ دیتی اور اس کا اعلان کرتی ہے کہ نہیں جسم اور پیٹ سے زیادہ ایک دوسری روشن حقیقت ہے اور وہی کامیابی کی راہ ہے "حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح" بازار کا شور اس نعرۂ حق کے سامنے دب جاتا ہے، اور سب حقیقتیں اس حقیقت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں اور اللہ کے بندے اس آواز پر دیوانہ وار دوڑ پڑتے ہیں، جب رات کو پورا شہر میٹھی نیند سوتا ہے اور جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع قبرستان ہوتی ہے دفعتاً موت کی اس بستی میں زندگی کا چشمہ اس طرح ابلتا ہے جس طرح رات کی سیاہی میں صبح کی سپیدی نمودار ہو "الصلوٰۃ خیر من النوم" سے اونگھتی سوتی انسانیت کو تازگی اور زندگی کا نیا پیغام ملتا ہے، جب کسی طاقت و سلطنت کا کوئی فریب خوردہ "انا ربکم الاعلیٰ" (میں تمہارا سب سے اونچا پروردگار ہوں اور "ما لکم من الٰہ غیری" (میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں) کا نعرہ لگاتا ہے تو ایک غریب مؤذن اسی کی مملکت کی بلندیوں سے "اللہ اکبر" کہہ کر اس کے دعوائے خدائی

کا تمسخر اڑاتا ہے اور "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کہہ کر حقیقی بادشاہت کا اعلان کرتا ہے، اس طرح دنیا کا مزاج بے اعتدالی سے اور اس کا دماغ بہکنے سے محفوظ رہتا ہے۔

اس عرفان، ایمان اور اعلان کا چشمہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی تعلیم و دعوت ہے، اور اب یہی عرفان، ایمان اور اعلان دنیا کی حیات نو کا سرچشمہ اور ہر صحیح و صالح انقلاب کا واحد ذریعہ ہے

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا[1]

---

[1] "تعمیر" لکھنؤ میں پہلی بار "دنیا کو ہماری ضرورت ہے" کے عنوان سے، بعد میں علیحدہ مضمون کی شکل میں "روشنی کا مینار" کے عنوان سے مکتبۂ اسلام نے شائع کیا تھا۔

غارِ حراء کی روشنی میں[1]

میں جبلِ نور پر چڑھا اور اس کے غار پر جو غار حرا کے نام سے مشہور ہے، جا کھڑا ہوا، یہاں پہونچ کر میں نے اپنے دل میں کہا، یہی جگہ ہے جہاں خداوندِ کریم نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کا شرف عطا فرمایا اور پہلی مرتبہ وحی نازل فرمائی، پس (یہ کہنا حق ہے کہ) یہیں سے وہ آفتاب طلوع ہوا جس کی کرنوں نے دنیا پر نور برسایا اور اسے ایک نئی زندگی بخشی، یہ عالم ہر دن ایک نئی صبح کو خوش آمدید کہتا ہے لیکن اکثر و بیشتر نہ اس صبح میں نیا پن ہوتا ہے نہ کوئی ندرت، اور نہ ہر صبح، صبحِ سعادت، ان صبحوں کی آمد سے انسان تو جاگ جاتے ہیں، مگر دلوں کی نیند میں ذرا فرق نہیں آتا اور روحوں کی بستی یونہی خوابِ غفلت میں پڑی رہتی ہے، کیا شمار ہے ایسے تاریک دلوں کا اور ایسی جھوٹی صبحوں کا! البتہ اس غار سے حقیقی معنی میں صبحِ صادق نمودار ہوئی تھی جس کے نور نے ہر چیز کو چمکایا اور اس کی آمد نے ہر شئے کو جگایا اور اسی صبح سے تاریخ کا رخ مڑا اور زمانہ کا رنگ بدلا۔

اس صبح سے پہلے انسانی زندگی کا فطری بہاؤ رکا ہوا تھا، اس کے ہر دروازہ پر بھاری قفل چڑھے ہوئے تھے اور وہ گویا چند مقفل دروازوں اور کچھ بند تالوں کا مجموعہ بنی ہوئی تھی، عقل پر

---

[1] ایک تقریر کا ترجمہ جو ربیع الاول ۱۳۷۶ھ میں سعودی ریڈیو اسٹیشن (جدہ) سے نشر کی گئی تھی۔

ترجمہ مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی نے کیا اور "الفرقان" ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ میں شائع ہوا۔

قفل چڑھے ہوئے تھے جن کو کھولنے سے حکماء اور فلاسفہ عاجز تھے، ضمیر انسانی مقفل تھا جس کو آزادی دلانے سے واعظین اور مصلحین عاجز تھے، قلوب انسانی مقفل تھے، جن کے قفل توڑنے میں قدرت کی نشانیاں اور زمانہ کے عبرت انگیز حوادث ناکام ہو چکے تھے، صلاحتیں مقفل تھیں جن کو بروئے کار لانے سے تعلیم و تربیت کا نظام اور ماحول اور سوسائٹی کے اثرات قاصر تھے، درسگاہوں کا وجود لاحاصل تھا جن کو کارآمد اور نتیجہ خیز بنانے میں اہل علم اور اہلِ درس بے بس تھے، عدالتیں کھلے ہونے کے باوجود مقفل تھیں جن سے انصاف حاصل کرنے کے لئے مظلوموں اور محکوموں کی فریادیں بے اثر تھیں، خاندانی مسائل الجھے ہوئے تھے جن کو سلجھانے سے مصلحین و مفکرین عاجز تھے، قصر ہائے سلطنت مقفل تھے، جن میں راہ پانے سے محنت کش کسان، پسے ہوئے مزدور اور مظلوم رعایا محروم تھی، دولت مندوں اور امیروں کے خزانے مقفل تھے جن کے قفل کھولنے سے ناداروں کی بھوک، ان کی عورتوں کی برہنگی اور ان کے دودھ پیتے بچوں کی گریہ وزاری عاجز تھی، بڑے بڑے مصلحین عزائم کے ساتھ میدان میں آئے، بڑے بڑے قانون ساز کمربستہ ہوئے لیکن ان بے شمار قفلوں میں سے کوئی ایک قفل بھی کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے کہ ان تالوں کی اصل کنجی ان کے ہاتھ میں نہ تھی، وہ کنجی ان کے ہاتھ میں نہ تھی وہ کنجی گم ہو چکی تھی، اور تالا بغیر اپنی کنجی کے کبھی کھل نہیں سکتا، انھوں نے اپنی بنائی ہوئی کنجیوں سے کام لینا چاہا، لیکن وہ ان تالوں کو نہ لگیں اور ایک تالا بھی نہ کھول سکیں اور بعض نے ان تالوں کو کھولنے کے بجائے توڑنے کی کوشش کی مگر الٹے اس کوشش میں ان کے اوزار ٹوٹ گئے اور ہاتھ بھی زخمی ہو گئے۔

ایسے وقت میں متمدن دنیا سے الگ تھلگ ایک چھوٹے سے خشک پہاڑ کے اوپر گمنام اور ظاہری اعتبار سے بے حیثیت مقام (غارِ حرا) میں دنیا کا وہ عقدۂ لاینحل حل ہوا جو نہ بڑی بڑی حکومتوں کی راجدھانیوں میں حل ہو سکا نہ عظیم الشان درسگاہوں میں حل ہو سکا اور نہ علم و ادب کے پرشکوہ

ایوانوں میں حل ہوسکا، یہاں پروردگار عالم نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صورت میں عالم انسانیت پر ایک احسان عظیم کا دروازہ کھولا اور صدیوں کی گم شدہ کنجی پھر سے انسانیت کو مل گئی، یہ کنجی ہے ایمان ——— اللہ پر، اس کے رسولؐ پر اور یوم آخرت پر ——— اس کنجی سے آپؐ نے صدیوں کے ان بند قفلوں کو ایک ایک کر کے کھول ڈالا جس کے نتیجے میں حیاتِ انسانی کے ہر ہر شعبہ کے دروازے چوپٹ کھل گئے، آپ نے جب نبوت کی اس کنجی کو عقل کے قفل پر رکھا تو اس کی ساری گرہیں کھل گئیں، اس کی سلوٹیں اور اس کے پیچ و خم دور ہو گئے، اسے نشاط فکر حاصل ہو گیا اور وہ اس قابل ہو گئی کہ انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں سے نفع اندوز ہو سکے، اس کائنات میں غور کر کے اس کے خالق کو پا سکے، کثرت کے پردوں کو چیر کر وحدت کا جلوہ دیکھ سکے اور شرک و بُت پرستی اور اوہام و خرافات کی لغویت کو محسوس کر سکے، حالانکہ اس سے پیشتر یہ عقل ان باتوں میں دخل دینے کی مجاز نہ تھی اور صدیوں سے اپنے منصب سے معزول تھی، اس کنجی سے آپ نے انسان کے ضمیر کا قفل کھولا، سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھا اور اس کے مردہ شعور و احساس میں حرکت اور زندگی پیدا ہوئی، ضمیر کی روک تھام سے آزاد ہو کر نفس انسانی جو صدیوں سے نفس امّارہ[1] بنا ہوا تھا، اب وہی نفس، نفس لوّامہ[2] میں تبدیل ہوا اور نفس لوّامہ دیکھتے ہی دیکھتے نفس مطمئنہ[3] بن گیا جس کے بعد اس میں کسی باطل کے گھسنے کی گنجائش نہ رہی اور گناہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا اس حد تک کہ گنہگار رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے جا کر از خود اپنے گناہ کا اظہار و اقرار کر کے اپنے لئے سخت ترین سزا کی درخواست کرتا ہے، ایک گنہگار عورت اپنے لئے سنگساری کی سزا کی درخواست کرتی ہے، حضورؐ عذر شرعی کی وجہ سے سزا کو کچھ دن کے لئے موخر فرماتے ہیں وہ اپنے دیہات کو واپس چلی جاتی ہے، نہ اس کی نگرانی

---

[1] برائی کا بہت زیادہ حکم دینے والا ۔ [2] غلطی پر سخت سرزنش اور ملامت کرنے والا۔

[3] جس کو پورا سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا ہو۔

کے لئے سی۔ آئی۔ ڈی متعین ہے نہ مجرم کو وقت پر دوبارہ حاضر کرنے کے لئے پولیس متعین ہے لیکن وہ بروقت پھر مدینہ میں پہونچتی ہے، اور خود کو اس سزا کے لئے بخوشی اور باصرار پیش کرتی ہے جو یقیناً قتل سے بھی زیادہ سخت ہے (یعنی سنگساری) فتح ایران کے وقت ایک غریب فوجی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج زریں آتا ہے وہ اس کو کپڑوں میں چھپالیتا ہے اور خفیہ طور سے اپنے امیر کی خدمت میں لے جاکر پیش کردیتا ہے تاکہ ادائے امانت تو ہو لیکن امانت داری کی نمائش نہ ہو۔

انسانوں کے وہ دل جو اس طرح مقفل پڑے ہوئے تھے کہ نہ ان میں عبرت پذیری تھی، نہ خوفِ خدا تھا، اور نہ رقت اور نرمی تھی، یہ کنجی جب ان کے دلوں پر لگائی گئی تو یکسر کایا پلٹتی ہوئی نظر آئی اب وہ خدا کے خوف سے ہر دم لرزاں و ترساں تھے، حوادث و واقعات سے عبرت حاصل کرتے تھے، انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیوں کا وجود اب ان کے لئے نفع بخش تھا، مظلوموں کا حال زار دیکھ کر تڑپ جاتے تھے، اور غریبوں بیکسوں کے ساتھ نفرت وحقارت کا برتاؤ کرنے کے بجائے محبت و شفقت کا برتاؤ کرنے لگے، اسی طرح نبوت کی اس کنجی نے جب انسانوں کی ان فطری صلاحیتوں اور قوتوں کو چھوا جو عرصہ سے ٹھٹھری پڑی تھیں اور نفع بخش ہونے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھیں تو وہ شعلوں کی طرح بھڑک اٹھیں اور سیلاب کی طرح موجیں مارتی ہوئی اُبل پڑیں اور صحیح رُخ پر لگ گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلاحیتوں کے ابھرنے کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے جو لوگ بکریوں کی گلہ بانی میں صائع ہو رہے تھے، وہ اب بہترین طور سے قوموں کی نگہبانی اور عالم کی فرمانروائی کی نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے لگے اور جو شخص کل تک صرف کسی ایک قبیلے یا ایک شہر کا نامور شہسوار شمار کیا جاتا تھا، وہ اب بڑی بڑی سلطنتوں اور ایسے ایسے ملکوں کا فاتح ثابت ہوا جو قوت وشوکت میں یکتا تھے۔

اسی کنجی سے آپ نے درسگاہوں کے قفل کھولے اور ان میں از سرِ نو چہل پہل اور رونق پیدا کی

حالانکہ علم کی کسادبازاری اور معلمین کی کس مپرسی اس حدتک پہونچ گئی تھی کہ معلمین کو دلچسپی رہی تھی، اور نہ متعلمین کو ـــــ آپ نے علم کی قدروقیمت یاددلائی، اہلِ علم کا مرتبہ بتلایا اور علم ودین کا باہمی تعلق سمجھایا، چنانچہ لوگ درسگاہوں کی ترقی کے لئے دامے درمے قدمے کوشاں ہوگئے، مسلمان کا ہرہر گھر اور ہرہر مسجد بجائے خود ایک مدرسہ بن گئی، ہر مسلمان اپنے حق میں متعلم اور دوسرے کے حق میں معلم بن گیا کیوں کہ ان کا دین ہی خود طلب علم کے لئے سب سے بڑا محرک تھا۔

آپ نے اسی کنجی سے عدالت کا تعطل ختم کیا، اب ہر قانون داں اس قابل تھا کہ اس پر ایک منصف جج کی حیثیت سے اعتماد کیا جاسکے اور ہر مسلمان حاکم اعلیٰ درجہ کا منصف شعار حاکم تھا اور یہ سچے مسلمان سب کے سب محض اللہ کے لئے سچی شہادتیں دینے والے تھے، جب اللہ اور آخرت کے حساب و کتاب پر ایمان استوار ہوا تو عدل وانصاف کی فراوانی ہوئی، بے انصافیاں اور بدعنوانیاں کم سے کم تر ہوگئیں اور جھوٹی شہادتیں اور ظالمانہ فیصلے ناپید ہوگئے، خاندانی معاملات جو اس قدر ابتر ہوگئے تھے کہ باپ بیٹے کے درمیان، بھائی بھائی کے درمیان، شوہر اور بیوی کے درمیان کشاکش اور چھین جھپٹ کا میدان گرم تھا، پھر یہ بیماری خاندانوں کے محدود میدان سے نکل کر معاشرہ کے وسیع میدان میں بھی پہونچ گئی تھی، یہی کشاکش نوکر اور مالک کے تعلقات میں بھی برپا تھی، حاکم اور رعیت کے تعلقات میں بھی برپا تھی، بڑے اور چھوٹے کے تعلقات میں بھی برپا تھی، ہر ایک کا یہ حال تھا کہ اپنا حق کسی طرح چھوڑنا نہ چاہتا تھا، اور دوسرے کا حق کسی طرح دینا نہ چاہتا تھا، خود اگر کوئی چیز خریدتا تو ناپ تول میں ذرا ذرا سی اونچ نیچ پر باریک بینی سے نظر رکھتا لیکن اگر دوسرے کے ہاتھ کچھ بیچتا تو کم سے کم ناپنے اور تولنے میں پوری مہارت بہم پہونچاتا (إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ) آپ نے اس خاندانی اور معاشرتی نظام کے عقدوں کا حل بھی اسی کنجی سے کیا، خاندان اور معاشرہ میں ایمان کا بیج بویا، لوگوں کو اللہ کی ناراضی سے ڈرایا اور اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد سنایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا۔ [1]

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا (اس طرح) کہ اس کا ایک جوڑا پیدا کیا اور دونوں (کی نسل) سے پھیلا دیئے، بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم مانگتے ہو اور قرابتوں کا خیال رکھو، بیشک اللہ تعالیٰ تم پر نگراں ہے۔

آپ نے خاندان اور معاشرہ کے افراد میں سے ہر ایک پر کچھ ذمہ داریاں ڈالیں، اسی طرح از سرِ نو خاندانی نظام کو بھی عدل، محبت اور راستی کی بنیادوں پر قائم فرمایا، اور معاشرہ کو بھی اعلیٰ درجہ کا عدل شعار بنایا، معاشرہ کے ہر ہر عضو میں امانت داری کا ایسا گہرا شعور اور خدا ترسی کا ایسا شدید احساس بیدار کر دیا کہ اس معاشرہ کے امراء اور عہدیداران تک پرہیزگاری اور سادہ زندگی کے نمونے بن گئے قوم کے سردار اپنے تئیں قوم کے خادم سمجھنے لگے، والیانِ سلطنت اپنی حیثیت یتیموں کے سرپرست سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے کہ اگر اپنی ذاتی ملکیت کچھ ہے تو سلطنت کے مال و دولت سے کچھ مطلب نہیں، اگر نہیں ہے تو بقدر ضرورت لینے پر قناعت ہے، اسی ایمان کی بدولت آپ نے دولت مندوں اور تاجروں میں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے دلچسپی پیدا کی، انھیں بتلایا کہ مال اصل میں اللہ کا ہے تمھیں اس نے اس کے تصرف میں اپنا نائب بنایا ہے۔

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ [2]

اور خرچ کرو اس (مال و دولت) میں سے جس میں اللہ نے تمھیں اپنا نائب بنایا ہے۔

وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ [3]

اور وہ ان (ضرورت مندوں کو) اس مال میں سے جو اللہ نے تمھیں دے رکھا ہے

انھیں تجوریوں میں بند کر کے رکھنے اور راہ خدا میں خرچ نہ کرنے سے یہ کہہ کر ڈرایا۔

---

[1] النساء۔۱ [2] الحدید۔۷ [3] النور۔۳۳

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝[1]

اور وہ لوگ جو سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے آپ انھیں بشارت دے دیجیے، دردناک عذاب کی اس دن جبکہ ان کے خزانوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں کروٹیں اور پشتیں داغی جائیں، لو یہ ہے تمہارا جمع کیا ہوا اب چکھو اس کا مزہ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیغام اور اپنی دعوت کے ذریعہ سے جس فرد کو تیار کر کے کارگہ حیات میں اتارا تھا، وہ اللہ پر سچا ایمان رکھنے والا، نیک خوئی کو پسند کرنے والا، اللہ کے خوف سے ڈرنے اور لرزنے والا، امانت کا پاس کرنے والا، دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والا، مادہ کو حقیر سمجھنے والا اور اپنی روحانیت سے مادیت پر غالب آنے والا تھا، وہ اس بات پر دل سے یقین رکھتا تھا کہ دنیا تو میرے لئے بنائی گئی ہے لیکن میں آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہوں، پس یہ فرد اگر تجارت کے میدان میں اترتا تو نہایت سچا اور ایماندار ثابت ہوتا، اگر مزدوری کا پیشہ اختیار کرتا تو نہایت محنتی اور بہی خواہ مزدور ثابت ہوتا، اگر مالدار ہو جاتا تو ایک رحم دل اور فیاض دولت مند ثابت ہوتا، اگر غریب ہوتا تو شرافت کو قائم رکھتے ہوئے مصیبتوں کو جھیلتا، اگر کرسی عدالت پر بٹھا دیا جاتا تو نہایت سمجھدار اور منصف جج ثابت ہوتا، اگر صاحب سلطنت ہوتا تو ایک مخلص اور بے غرض حکمراں ثابت ہوتا، اگر آقا ہوتا تو رحم دل اور منکسر المزاج آقا ہوتا، اگر نوکر ہوتا تو نہایت چست اور فرمانبردار نوکر ہوتا اور اگر قوم کا مال و دولت اس کی تحویل میں آجاتا تو حیرت انگیز بیداری اور باخبری سے اس کی نگرانی کرتا۔

یہ تھیں وہ اینٹیں جن سے اسلامی سوسائٹی کی تعمیر کی گئی اور جن پر اسلامی حکومت کی عمارت

---

[1] التوبہ ۳۴، ۳۵

کھڑی کی گئی، اسی بناپر یہ سوسائٹی اور یہ حکومت ایک بڑے پیمانہ پر افراد کے اخلاق، ان کی نفسیات اور ان کے طرزِ حیات کا مظہر تھی، افراد میں جو چیزیں تھیں وہ سب کی سب معاشرہ میں جمع ہو گئی تھیں، اس کے تاجر کی سچائی اور ایمانداری اس میں تھی، اس کے غریب کی خودداری اور مشقت کوشی اس میں تھی، اس کے مزدور کی محنت کشی اور بہی خواہی اس میں تھی، اس کے دولت مند کی فیاضی اور غمخواری اس میں تھی، اس کے جج کی فراست اور عدالت اس میں تھی، اس کے حکمرانوں کا خلوص اور دیانتداری اس میں تھی، اس کے آقا کا انکسار اور رحم دلی اس میں تھی، اس کے خادم کی جفاکشی اور چستی اس میں تھی، اور اس کے خزانچی کی نگرانی اور بیداری بھی اس میں پوری پوری موجود تھی، اسلامی سوسائٹی جس طرح اپنے افراد کی خوبیوں کی مظہرِ اتم تھی، اسی طرح اسلامی حکومت بھی تمام خوبیوں کی جامع بلکہ ان کا قوی محرک بن گئی تھی، یہ حکومت راست رو تھی، عقیدوں اور اصولوں کو منافع اور مصالح پر ترجیح دیتی تھی، عوام کو لوٹنے کے بجائے ان کے اخلاق وعقائد کو بنانے اور سنوارنے کی دلسوزی سے کوشش کرتی تھی، سوسائٹی اور حکومت کے اثرات کا نتیجہ یہ تھا کہ انفرادی اور اجتماعی، پرائیوٹ اور ـــــــ پبلک زندگی کا ہر ہر گوشہ ایمان وعمل، صدق وخلوص محنت وکوشش اور عدل وانصاف سے سجا ہوا اور ان سدابہار پھولوں کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔

میں غارِ حرا پر کھڑا کھڑا یہ تمام باتیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا، میں اپنے ان خیالات اور عہدِ رفتہ کی یاد میں اتنا غرق ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے وجود سے بالکل بے خبر ہو گیا، میرا تصور مجھے اپنے ماحول اور اپنے زمانہ سے اڑا کر الگ لے گیا، میری نگاہوں میں اس عہدِ رفتہ کی عمومی اسلامی زندگی کی تصویر پھرنے لگی، میں اس کا رخ جمال اور ایک ایک خط وخال دیکھنے لگا اور بالکل ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہی زندگی میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور میں اس کی روح نواز فضاؤں میں سانس لے رہا ہوں، اسی عالمِ تصور میں مجھے اپنے زمانہ کا خیال آیا جس کی فضا میں واقعی میں سانس لیتا ہوں،

میں نے کہا کہ آج بھی زندگی کی کامیابی اور خوش گواری کے دروازوں پر کچھ نئے قسم کے تالے پڑے نظر آ رہے ہیں، مسائل میں پھیلاؤ اور تنوع کی کوئی حد نہیں ہے اور اسی نسبت سے الجھاؤ اور پیچیدگیاں بھی بڑھ گئی ہیں تو کیا اس حالت میں بھی اسی پرانی کنجی سے یہ نئے قفل کھل سکتے ہیں؟

یہ سوال میرے دل میں پیدا ہوا مگر میں نے کہا کہ جب تک میں ان تالوں کو اچھی طرح دیکھ بھال کے ان کی حقیقت نہ معلوم کر لوں مجھے کوئی جواب نہ دینا چاہیئے، چنانچہ میں نے جو ان تالوں کو ہاتھ لگایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ تالے نئے نہیں ہیں، وہی پرانے ہیں صرف رنگ و روغن نیا ہے اور نہ یہ پیچیدگیاں اور الجھنیں ہی نئی ہیں ان کی جڑ تو ہوبہو پرانی ہے، آج بھی اصل مسئلہ فرد کا مسئلہ ہے جو سارے دوسرے مسائل کا سرا ہے اور یہی ہمیشہ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ رہا ہے کیونکہ فرد وہ اینٹ ہے جس سے سوسائٹی اور حکومت بنتی ہے اور اس کا حال آج یہ ہو گیا ہے کہ مادہ اور قوت کے سوا کسی چیز کو ماننے کے لئے یہ تیار نہیں ہے، اپنی ذات اور خواہشات کے ماسوا اسے کسی چیز سے مطلب نہیں ہے اس دنیا کی قدر و قیمت اس کی نظر میں حقیقت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے، لذت اور خواہشات کی بندگی حد سے گزر گئی ہے، اور اپنے پروردگار سے، انبیاء کی رسالت سے، اور عقیدۂ آخرت سے رشتہ بالکل ٹوٹ چکا ہے، بس یہی فرد کا بگاڑ ہے جو سوسائٹی کے بگاڑ کا سرچشمہ اور تہذیب کی بدبختی کا ذمہ دار ہے

یہ فرد اگر تجارت کرتا ہے تو لالچ اور ذخیرہ اندوزی کا بدترین مظاہرہ کرتا ہے ارزانی کے وقت مال روک لیتا ہے اور گرانی کے زمانہ میں نکالتا ہے اور اس طرح لوگوں کی بھوک اور پریشانی کا سبب بنتا ہے، یہ فرد اگر مفلس ہوتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ اپنی مفلسی کو دور کرنے کے لئے خود کچھ نہ کرے اور دوسروں کی محنتوں کا پھل مفت میں کھالے، اگر مزدوری کرتا ہے تو اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے لیکن مزدوری پوری لینا چاہتا ہے، اگر دولتمند ہوتا ہے تو اعلیٰ درجہ کا کنجوس اور سنگ دل ہوتا ہے، اگر صاحب اقتدار ہوتا ہے تو لٹیرا اور بددیانت ثابت ہوتا ہے، اگر

مالک ہوتا ہے تو ایک ظالم اور خود غرض مالک ثابت ہوتا ہے جو اپنے فائدے اور اپنے آرام کے سوا کچھ دیکھنا نہیں جانتا، اگر نوکر ہوتا ہے تو کام چور اور بے ایمان، اگر خزانچی بنا دیا جاتا ہے تو غبن کرتا ہے، اگر حکومت کا وزیر یا جمہوریہ کا صدر ہو جاتا ہے تو شکم پرور، روح سے بے خبر اور بندۂ نفس ثابت ہوتا ہے، جو صرف اپنی ذات اور اپنی پارٹی کے فائدے کو دیکھتا ہے، اگر لیڈر بن جاتا ہے اور بہت ہی ترقی پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے تو بھی اس قوم اور وطن کے حدود سے آگے نہیں بڑھنے پاتا اور اپنے وطن اور قوم کی عزت بڑھانے کے لئے دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں کی عزت وآبرو خاک میں ملانے سے کسی وقت بھی گریز نہیں کرتا، اگر قانون سازی کا اختیار ہاتھ میں آجاتا ہے تو ظلم کے قانون اور بڑے بڑے ٹیکس مسلط کر دیتا ہے، اگر اس کے دماغ میں ایجاد واکتشاف کی صلاحیت ہوتی ہے تو ہلاکت برسانے والے اور تباہی پھیلانے والے آلات ایجاد کرنے لگتا ہے، زہریلی گیسیں ایجاد کرتا ہے جو نوع انسانی کو ہلاک کر دیں، بمبار طیارے اور ٹینک بناتا ہے جو بستیوں کو کھنڈر اور راکھ کا ڈھیر بنا ڈالیں، ایٹم بم بناتا ہے جس کی ہلاکت خیزیوں سے نہ انسان بچ سکتے ہیں، نہ حیوان نہ کھیت نہ باغات اور جب اس فرد کو ان ایجادات کے استعمال کرنے کی قوت بھی مل جاتی ہے، تو بستیاں کی بستیاں اندھا دھند نشانے پر رکھ لیتا ہے، اور آن کی آن میں زندوں کے شہر، شہر خموشاں بنا ڈالتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب اچھے افراد سے مرکب ہونے والا معاشرہ اور ان سے تیار ہونے والی حکومت ان افراد کی تمام خوبیوں کی آئینہ دار ہوتی ہے تو برے افراد سے تیار ہونے والا معاشرہ اور حکومت دونوں لامحالہ ان تمام افراد کی تمام برائیوں اور بیماریوں کی حامل ہوگی، اس میں تاجروں کی ذخیرہ اندوزی بھی ہوگی، نفع کا لالچ بھی ہوگا، تنگ دستوں کی سرکشی بھی ہوگی، مزدور کی کم محنت اور زیادہ اجرت کی بری عادت بھی ہوگی، دولت مند کی ہوس کے جراثیم بھی اڑ کر اسے لگیں گے، اپنے

حکمراں کی بدنیتی اور عیاری بھی اس میں پھیلے گی، مالکوں کا جور وستم بھی اس کی عادت میں داخل ہوگا نوکر کی خیانت اور خازن کا غبن بھی اس میں سرایت کرے گا، وزراء کی نفع پرستی اور لیڈروں کی وطن پرستی بھی گل کھلائے گی، قانون سازوں کے اندھیر اور سائنس دانوں کی بے راہ روی بھی اپنا جوہر دکھلائے گی، اور زرداروں کی سنگ دلی بھی اس پورے معاشرہ اور حکومت میں رنگ لائے گی۔

یہ ہے وہ اصل مادۂ فساد جس کے بطن سے وہ تمام بیماریاں، وہ تمام الجھنیں اور وہ تمام پے چیدگیاں پیدا ہوئی ہیں، جن سے انسانیت پریشان اور زار و نزار ہے، اس مادۂ فساد کا نام ہے مادہ پرستی کا ذوق، یا مادہ اور اس کے مظاہر ہی کو سب کچھ سمجھنے کا عقیدہ، بلیک مارکٹنگ اسی کا قدرتی نتیجہ ہے، رشوت ستانی اسی کا ادنیٰ کرشمہ ہے، ہوش ربا گرانی اور مہنگائی اسی کا ایک شگوفہ ہے، ذخیرہ اندوزی اسی کا عطیہ ہے، افراطِ زر اسی کا ثمرہ ہے، آج کے مفکرین اور مقننین آج تک ان مشکلات کا کوئی کامیاب حل نہیں ڈھونڈھ کر لا سکے، ایک مشکل کو حل کرتے ہیں تو دوسری نئی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں، ایک گرہ کھلتی ہے تو کئی اور نئی گرہیں لگ جاتی ہیں بلکہ اب تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ان کی عقدہ کشائی بجائے خود نئے نئے عقدوں کو جنم دے رہی ہے، جیسے عطائی طبیب کے علاج سے صحت کے بجائے کچھ نئے نئے مرض اور پیدا ہو جائیں ـــــــ یہ اس مریض پر روز نئے تجربے کر رہے ہیں، انھوں نے سمجھا کہ شخصی حکومت ان تمام امراض کا سبب ہے، لہذا اسے ختم کر کے جمہوری طرز حکومت کی بنیاد ڈالی، مگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوا تو بعض نے پھر آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کو اختیار کیا، اس سے اور خرابیاں بڑھتے دیکھیں تو پھر جمہوریت کی طرف رجوع کیا، ایسے ہی کبھی نظام سرمایہ داری کو اختیار کیا اس سے اور گرہیں بڑھیں تو کمیونزم اور سوشلزم کو اپنے درد کا درماں سمجھ لیا مگر معاملہ کی نوعیت ذرا نہ بدلی اور مشکلات جوں کی توں قائم یا پہلے سے کچھ دشوار ہو گئیں، کیوں ـــــــ؟ اس لئے کہ یہ ساری تبدیلیاں اور سارا ردو بدل اوپر اوپر ہوتا رہا اور

مشکلات کی جو جڑ اور بنیاد ہے یعنی فرد اور اس کا بگاڑ! اس کو ہاتھ نہیں لگایا گیا اس میں کسی اصلاح و تغیر کی کوشش نہیں کی گئی اور قصداً یا بلا قصد اس حقیقت سے غفلت ہوتی گئی کہ اصل فساد اور ٹیڑھ فرد میں ہے، جس کی بدولت معاشرہ اور حکومت میں بھی ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ مفکرین و مصلحین اس حقیقت کو خوب سمجھ بھی لیتے اور برائیوں کی اس جڑ کو پا بھی لیتے تب بھی اس کا علاج ان کے بس کی بات نہ تھی، مانا کہ ان کے پاس اشاعت علم کے موثر ذرائع ہیں اور یہ دور ہی تعلیم و تربیت کا دور ہے مگر ان کے ہاتھ میں وہ طاقت نہیں ہے، جس سے فرد کا رُخ شر سے خیر کی طرف اور تخریب سے تعمیر کی طرف موڑ دیں کیوں کہ ان کے دل و دماغ روحانیت بلکہ روح کی وقعت ہی سے عاری اور ایمان سے خالی ہیں، ان کے پاس دل کو غذا دینے اور اس میں ایمان کا پودا لگانے کا سامان نہیں ہے، ان کے ہاتھوں سے وہ چیز نکل چکی ہے جو عبد و معبود کے درمیان رشتہ جوڑے، اس زندگی کے ساتھ دوسری زندگی کا تعلق قائم کرے، روح و مادہ کے درمیان توافق پیدا کرے اور علم کو اخلاق سے وابستہ کرے، ان کے روحانی افلاس، اندھی مادیت اور عزور عقل نے تو اب اس حد تک پہونچا دیا ہے کہ تخریب و تباہی کا آخری تیر بھی اپنے ترکش میں جمع کر لینا چاہتے ہیں جس کی ہلاکت خیزیوں سے انسانیت کا پورا کنبہ نیست و نابود اور پورا کرۂ ارض اُجاڑ اور ویران ہو سکتا ہے، خدا نخواستہ اگر اس وقت دنیا کی متحارب طاقتوں نے ان خوفناک ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کا میدان گرم کیا تو یقیناً ان کے یہ نو ایجاد آلات تہذیب و انسانیت کا خاتمہ کر دیں گے۔

نبوت کا کارنامہ[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی و نبوت کے ذریعہ اپنے پیغمبروں کو انسانوں کی اصلاح و تکمیل پر مامور فرمایا اور ان حضرات نے اپنی دعوت و محنت کا موضوع انسان کو بنایا، انبیاء علیہم السلام کی بصیرت پر اللہ تعالیٰ نے یہ نکتہ فاش کیا کہ اس دنیا کی قسمت اور اس کی آبادی و ویرانی کا فیصلہ انسان پر معلق ہے، اگر حقیقی انسان موجود ہے تو یہ دنیا اپنی سب ویرانیوں اور بے سروسامانیوں کے ساتھ آباد و معمور ہے اور اگر حقیقی انسان موجود نہیں تو یہ دنیا اپنی ساری رونقوں اور اپنے ساز و سامان کے ساتھ ایک ویرانہ اور خرابہ سے بہتر نہیں، اس دنیا کی بدقسمتی آلات و وسائل کی کمی اور فقدان سے نہیں، بلکہ ان کے غلط استعمال سے ہے، دنیا کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اس کو انسان کی غلط اندیشی اور بے راہ روی نے تباہ کیا، آلات و وسائل نے اس تباہی اور ہلاکت خیزی میں صرف اضافہ کیا۔

پھر انسان اپنی عظمت، اپنی وسعت، اپنی مرکزیت اور اپنی حکیمانہ صفت کے اعتبار سے کہیں زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو سعی و محنت اور توجہ و خدمت کا موضوع بنایا جائے، یہ کائنات

---

[1] یہ مضمون ۱۹ / دسمبر ۱۹۵۹ء کو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی یونین ہال میں شعبۂ دینیات کی دعوت پر پڑھا گیا اور ماہنامہ "الفرقان" بابت ماہ رجب ۱۳۷۹ھ میں شائع ہوا، تمہید حذف کردی گئی ہے۔

بڑی پُراسرار بڑی پُراز عجائبات، بڑی حسین وجمیل، بڑی طویل و عریض ہے، لیکن انسان کی فطرت کے اسرار و عجائبات اس کے مخفی خزانوں اور دفینوں، اس کے قلب کی وسعتوں، اس کے دماغ کی بلند پروازیوں، اس کی روح کی بے تابیوں اور گرم جوشیوں، اس کی غیر مختتم تمناؤں اور ناآسودہ حوصلوں، اور اس کی غیر محدود صلاحیتوں کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں، ایسی کئی دنیائیں اس کے قلب کی وسعتوں میں، اور یہ سارے سمندر اس کے دل کی گہرائیوں میں گم ہو جائیں، پہاڑ اس کے یقین کا، آگ اس کی محبت کے سوز کا، سمندر اس کے قطرۂ اشک کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس کی حسن سیرت کے سامنے دنیا کا ہر حسن ماند ہے، اس کے عزم و ارادہ کے آگے ہر طاقت سرنگوں ہے، اس انسان میں صحیح یقین، صحیح خواہش اور صحیح ملکات اور اخلاق کا پیدا کرنا اور اس سے خلافت الٰہی کا کام لینا نبوت کا اصل کارنامہ ہے۔

ہر نبوت نے اپنے دور میں یہ کارنامہ انجام دیا اور ایسے افراد تیار کئے، جنھوں نے اس دنیا کو نئی زندگی بخشی اور زندگی کو (جو انسان کی خود فراموشی اور غلط اندیشی سے) بے معنی ہو گئی تھی، بامعنی بنایا، نبوت کے ان کارناموں میں جو زندگی کی پیشانی پر درخشاں و تاباں ہیں سب سے روشن کارنامہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ ہے جس کی سب سے زیادہ تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، مردم سازی و آدم گری کے اس کام میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کامیابی عطا فرمائی، وہ آج تک کسی انسان کو حاصل نہیں ہوئی، آپ نے جس سطح سے تعمیر انسانیت کا کام شروع کیا، اس سطح سے کسی پیغمبر اور کسی مصلح اور کسی مربی کو شروع کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی تھی، یہ وہ سطح تھی جہاں حیوانیت کی سرحد ختم ہوتی تھی اور انسانیت کی سرحد شروع ہوتی تھی، اور جس سطح پر آپ نے اس کام کو پہونچایا اس سطح تک بھی کبھی تعمیر انسانیت کا کام نہیں پہونچا تھا جس طرح آپ نے انسانیت کی انتہائی پستی سے کام شروع کیا، اسی طرح انسانیت کی آخری بلندی تک اس کام کو پہونچایا، آپ کے تیار کئے ہوئے افراد

میں سے ایک ایک نبوت کا شاہکار ہے اور نوع انسانی کے شرف و افتخار کا باعث، انسانیت کے مرقع میں بلکہ اس پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین و جمیل، اس سے زیادہ دلکش و دل آویز تصویر نہیں ملتی جو ان کی زندگی میں نظر آتی ہے، ان کا پختہ یقین، ان کا گہرا علم، ان کا سچا دل، ان کی بے تکلف زندگی، ان کی بے نفسی و خدا ترسی، ان کی پاک بازی و پاکیزگی، ان کی شفقت و رافت اور ان کی شجاعت و جلادت، ان کا ذوقِ عبادت اور ان کا شوقِ شہادت، ان کی شہسواری اور ان کی شب زندہ داری، ان کی سیم و زر سے بے پرواہی اور ان کی دنیا سے بے رغبتی، ان کا عدل اور ان کا حسن انتظام، دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، نبوت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانی افراد تیار کئے، ان میں سے ایک ایک فرد ایسا تھا، جو اگر تاریخ شہادت پیش نہ کرتی اور دنیا اس کی تصدیق نہ کرتی تو ایک شاعرانہ تخیل اور ایک فرضی افسانہ معلوم ہوتا لیکن وہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے، وہ ایک ایسا انسانی وجود تھا جس میں نبوت کے اعجاز نے متضاد اوصاف و کمالات پیدا کر دیئے تھے۔

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب — عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقیٔ ارباب ذوق، فارس میدان شوق — بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

یہ فرد جب تیار ہو گیا تو یہ بندگی اور زندگی کے ہر محاذ پر کار آمد مستعد اور قیمتی ثابت ہوا اور جو خدمت اس کے سپرد کی گئی اس نے اپنی اہلیت و صلاحیت اور اپنی فرض شناسی اور احساس ذمہ داری اور اپنے ذوق عمل اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیا، اس کو اگر فیصلہ اور ثالثی

کا کام سپرد کیا گیا تو وہ بہترین قاضی اور لائق ترین جج ثابت ہوا، جس نے ترازو کے تول فیصلہ کیا، وہ اگر فوجوں کا سپہ سالار اور قائد مقرر ہوا تو اس نے اپنی جنگی قابلیت، بیدار مغزی اور شجاعت اور مرحمت کا ثبوت دیا، اگر فوجوں کی کمان اس کے حوالہ کردی گئی تو ایک مستعد اور کارگزار اور ایک جری اور جانباز سپاہی ثابت ہوا، اگر اس کو فوجوں کی قیادت کے منصب علیا سے معزول کردیا گیا تو اس کی پیشانی پر ناراضگی کی ایک شکن اور اس کی زبان پر شکایت کا ایک حرف نہیں آیا اور لوگوں نے اس کی مستعدی اور جوش ونشاط میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا، اگر وہ نوکروں کا آقا اور محکمہ کا افسر تھا تو ایک فراخ دل اور شفیق آقا اور ایک خیر خواہ اور محبت کرنے والا بزرگ خاندان، اور اگر وہ مزدور واجیر تھا تو وہ ایک فرض شناس و مستعد مزدور تھا، جس کو اپنی مزدوری کے اضافہ سے زیادہ کام کے اضافہ کی فکر تھی، وہ فرد اگر فقیر تھا تو فقیر صابر و قانع اور اگر غنی تھا تو غنی شاکر اور محسن، وہ اگر عالم تھا تو علم کو عام کرنے اور لوگوں کو خدا کا راستہ بتلانے کا حریص اور اپنے علم کی تقسیم میں فیاض، اور اگر طالب علم تھا تو علم صحیح کے حصول کا شائق اور اس کو اعلیٰ درجہ کی عبادت سمجھ کر اس کی طلب میں منہمک اور اس کے لئے بڑی سے بڑی محنت اور بڑی سے بڑی خدمت کرنے والا تھا، اور اگر وہ کسی شہر کا حاکم تھا تو راتوں کو پہرہ دینے والا اور دن کو انصاف کرنے والا تھا، غرض یہ فرد انسانی معاشرہ کے جس مقام اور جس محاذ پر تھا، نگینہ کی طرح جڑا ہوا تھا۔

دنیا کی سب سے زیادہ نازک اور خطرناک ذمہ داری (حکومت) جب اس کے سپرد ہوئی تو اس نے زہد و فقر اور ایثار و قربانی اور جفاکشی و سادگی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ دنیا محو حیرت رہ گئی اور ابھی تک اس کے تحیر میں کوئی کمی نہیں، آیئے ہمارے ساتھ خلافت راشدہ کے ان واقعات کو پڑھ لیجئے، عہد صدیقی کا مورخ لکھتا ہے:۔

"ایک روز حضرت ابوبکرؓ کی بیوی نے، شیرینی کی فرمائش کی جواب دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں،

انھوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں خرچ روزمرہ میں سے کچھ دام بچا کر جمع کر لوں، فرمایا جمع کرو، کچھ روز میں چند پیسے جمع ہو گئے، تو حضرت ابوبکرؓ کو دیئے کہ شیرینی لا دو، پیسے لے کر کہا معلوم ہوا کہ یہ خرچ ضروری سے زیادہ ہیں، لہٰذا بیت المال کا حق ہے، چنانچہ وہ پیسے خزانے میں جمع کر دیئے اور اسی قدر اپنا وظیفہ کم کر دیا۔[1]

آپ نے بہت سی مملکتوں کے بادشاہوں اور بہت سی جمہوریتوں کے سربراہوں کے سرکاری دوروں کی روداد سنی ہوگی اور ان کے شاہانہ تزک، احتشام اور کر و فر کا تماشا دیکھا ہوگا، ساتویں صدی مسیحی کے سب سے بڑے طاقت ور فرماں روا حضرت عمرؓ کے سرکاری دورہ (سفر شام) کی روداد مورخ کی زبان سے سنئے، مولانا شبلی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "الفاروق" میں ۱۶ھ کے سفر بیت المقدس کا حال بیان کرتے ہوئے مستند عربی تاریخوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

"ناظرین کو انتظار ہوگا کہ فاروق اعظم کا سفر اور سفر بھی وہ جس سے دشمنوں پر اسلامی جلال کا رعب بٹھانا مقصود تھا کس سر و سامان سے ہوگا؟ لیکن یہاں نقارہ و نوبت، خدم و حشم، لاؤ لشکر ایک طرف، معمولی ڈیرہ اور خیمہ تک نہ تھا، سواری میں گھوڑا تھا اور چند مہاجرین و انصار ساتھ تھے، تاہم جہاں یہ آواز پہونچتی تھی کہ فاروق اعظم نے مدینہ سے شام کا ارادہ کیا ہے زمین دہل جاتی تھی۔

جابیہ میں دیر تک قیام رہا اور بیت المقدس کا معاہدہ بھی یہیں لکھا گیا، معاہدہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا ارادہ کیا، گھوڑا جو سواری میں تھا اس کے سُم گھس کر تمام ہو گئے تھے اور رُک رُک کر قدم رکھتا تھا، حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر اتر پڑے، لوگوں نے ترکی نسل کا ایک عمدہ گھوڑا حاضر کیا، گھوڑا شوخ اور چالاک تھا، حضرت عمرؓ سوار ہوئے تو اٹیل کرنے لگا فرمایا کمبخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سیکھی؟ یہ کہہ کر اتر پڑے اور پیادہ پا چلے، بیت المقدس

---

[1] سیرۃ الصدیق صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

قریب آیا تو حضرت ابو عبیدہ اور سرداران فوج استقبال کو آئے، حضرت عمرؓ کا لباس اور سرو سامان جس معمولی حیثیت کا تھا اس کو دیکھ کر مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی اپنے دل میں کیا کہیں گے، چنانچہ لوگوں نے ترکی گھوڑا اور عمدہ قیمتی پوشاک حاضر کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے یہی بس ہے"[۱]

دوسرے سفر شام (۱۸ھ) کا حال بھی سن لیجئے:۔

"حضرت عمرؓ نے شام کا قصد کیا، حضرت علیؓ کو مدینہ کی حکومت دی اور خود ایلہ کو روانہ ہوئے، یرفا ان کا غلام اور بہت سے صحابہ ساتھ تھے، ایلہ کے قریب پہونچے، کسی مصلحت سے اپنی سواری غلام کو دی اور خود اس کے اونٹ پر سوار ہوئے، راہ میں جو لوگ دیکھتے تھے پوچھتے تھے کہ امیر المومنین کہاں ہیں؟ فرماتے کہ تمہارے آگے، اسی حیثیت سے ایلہ میں آئے اور یہاں دو ایک روز قیام کیا، گزی کا کرتہ جو زیب بدن تھا، کجاوے کی رگڑ کھا کر پیچھے سے پھٹ گیا تھا، مرمت کے لئے ایلہ کے پادری کے حوالہ کیا، اس نے خود اپنے ہاتھ سے پیوند لگائے اور اس کے ساتھ ایک نیا کرتہ تیار کر کے پیش کیا، حضرت عمرؓ نے اپنا کرتہ پہن لیا اور کہا اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے"[۲]

خلفائے راشدین اور صحابۂ کرامؓ کی سیرت کے مختلف پہلو اور ان کے محاسن اخلاق کتابوں میں متفرق و منتشر موجود ہیں، ان سب کو جمع کر کے آپ اپنے ذہن میں ایک فرد کی مکمل زندگی اور پوری تصویر تیار کر سکتے ہیں، لیکن خوش قسمتی سے ان میں سے ایک (سیدنا علیؓ ابن ابی طالب) کا پورا اخلاقی سراپا اور ان کی زندگی کی تصویر ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، اس کو پڑھئے اور دیکھئے کہ ایک انسان کی سیرت و اخلاق کی اس سے زیادہ حسین و دلکش تصویر کیا ہو سکتی ہے، اور نبوت

---

[۱] الفاروق ص ۱۰۰-۱۰۱ [۲] ایضاً ص ۱۱۳

نے اپنی تعلیم و تربیت اور اپنی مردم سازی و کیمیا گری کے کیسے یادگار نمونے چھوڑے ہیں' ان کی خدمت میں شب و روز رہنے والے ایک رفیق ضرار بن ضمرہ اس طرح ان کی تصویر کھینچتے ہیں۔

"بڑے بلند نظر، بڑے عالی ہمت، بڑے طاقت ور، جچی تلی گفتگو فرماتے، حق و انصاف کے مطابق فیصلہ فرماتے' زبان و دہن سے علم کا چشمہ اُبلتا' ہر ادا سے حکمت ٹپکتی' دنیا اور بہارِ دنیا سے وحشت تھی' رات اور رات کی تاریکی میں خوش رہتے' آنکھیں پُر آب' ہر وقت فکر و غم میں ڈوبے ہوئے' رفتارِ زمانہ پر متعجب' نفس سے ہر وقت مخاطب' کپڑا وہ مرغوب جو موٹا جھوٹا ہو' غذا وہ مرغوب جو غریبانہ اور سادہ ہو' کوئی امتیازی شان پسند نہیں کرتے تھے' جماعت کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے' ہم سوال کرتے تو یہ جواب دیتے' ہم حاضر خدمت ہوتے تو سلام و مزاج پرسی میں پہل کرتے' ہم مدعو کرتے تو دعوت قبول فرماتے' لیکن اس قرب و مساوات کے باوجود رعب کا یہ عالم تھا کہ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی اور سلسلۂ سخن کا آغاز کرنا مشکل ہوتا' اگر کبھی مسکراتے تو دانت موتی کی لڑی معلوم ہوتے' دینداروں کی عزت اور مساکین سے محبت کرتے تھے' لیکن اس تواضع و مسکنت کے باوجود کسی طاقت ور اور دولت مند کی مجال نہ تھی کہ ان سے کوئی غلط فیصلہ کروالے یا ان سے کوئی رعایت حاصل کرلے اور کمزور کو ہر وقت ان کے عدل و انصاف کا بھروسہ تھا۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان کو ایک شب ایسی حالت میں دیکھا کہ رات نے اپنی ظلمت کے پردے ڈال دیئے تھے' اور ستارے ڈھل چلے تھے۔ آپ اپنی مسجد کی محراب میں کھڑے تھے داڑھی مٹھی میں تھی' اس طرح تڑپ رہے تھے' جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو' اس طرح رو رہے تھے' جیسے دل پر چوٹ لگی ہو' اس وقت میرے کانوں میں ان کے یہ الفاظ گونج رہے ہیں۔

'اے دنیا! اے دنیا! کیا تو میرا امتحان لینے چلی ہے اور مجھے بہکانے کی ہمت کی ہے' یا یوں

ہو جا کسی اور کو فریب دے، میں نے تو تجھے ایسی تین طلاقیں دی ہیں جن کے بعد رجعت کا کوئی سوال نہیں، تیری عمر کوتاہ، تیرا عیش بے حقیقت، تیرا خطرہ زبردست، ہائے زادِ راہ کس قدر کم ہے، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک ہے۔"[1]

نبوت کا یہ کارنامہ زمانۂ بعثت اور پہلی صدی ہجری کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ کی تعلیمات نے اور آپ کے صحابۂ کرام نے زندگی کے جو نمونے چھوڑے تھے، وہ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں اور وسیع عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ہر شعبۂ زندگی اور صنفِ کمال میں عظیم انسان پیدا کرتے رہے جن کی انسانی بلندی شک و شبہہ اور اختلافات سے بالاتر ہے، اس لازوال "مدرسۂ نبوت" کے فضلاء اور تربیت یافتہ (جنھوں نے صرف اسی مدرسہ سے انسانیت و اخلاق اور خدا شناسی اور انسان دوستی کا سبق لیا تھا) اپنے اپنے زمانہ کی زیب و زینت اور انسانیت کے شرف و عزت کا باعث ہیں، کسی مورخ اور کسی بڑے سے بڑے مصنف اور محقق کی یہ طاقت نہیں کہ ان لاکھوں اہلِ یقین اور اہلِ معرفت کے ناموں کی صرف فہرست بھی پیش کر سکے، جو اس تعلیم کے اثر سے مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر پیدا ہوتے رہے، پھر ان کے مکارمِ اخلاق، ان کی بلند انسانیت، ان کے روحانی کمالات کا احاطہ تو کسی طرح ممکن نہیں، ان کے حالات کو (جو کچھ بھی تاریخ محفوظ کر سکی ہے) پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ خاکی انسان روحانی ترقی، نفس کی پاکیزگی، حوصلہ کی بلندی، انسان کی ہمدردی، طبیعت کی فیاضی، ایثار و قربانی، دولتِ دنیا سے بے نیازی، سلاطین وقت سے بے خوفی، خدا شناسی و خدادانی اور غیبی حقیقتوں پر ایمان و یقین کے ان حدود اور بلندیوں تک بھی پہونچ سکتا ہے؟ ان کے یقین نے لاکھوں انسانوں کے دلوں کو یقین سے بھر دیا، ان کے عشق نے لاکھوں انسانوں کے سینوں کو عشق کی حرارت اور

---

[1] صفوۃ الصفوہ ابن جوزیؒ ج ۱

سوز سے گرم و روشن کر دیا، ان کے اخلاق نے خونخوار دشمنوں کو جاں نثار اور لاکھوں حیوان صفت انسانوں کو حقیقی انسان بنا دیا، ان کی صحبت اور ان کے فیض و تاثیر نے خدا طلبی اور خدا ترسی اور انسان دوستی کا عام ذوق پیدا کر دیا، ہمارا ملک ہندوستان اس بارے میں بڑا خوش نصیب ہے کہ وہ اپنے آغوش میں بکثرت ایسے مردانِ خدا کو لئے ہوئے ہے جنھوں نے اپنے عہد میں انسانیت کو بلند اور انسان کا نام روشن کیا تھا۔

بادشاہوں کی صف میں بھی جو کشورستانی اور ملک گیری اور عیش کوشی کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے، اس تعلیم نے ایسے درویش صفت اور زاہد سیرت بادشاہ پیدا کئے، جنھوں نے زہد و ایثار کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی نظیر تارک الدنیا درویشوں اور گوشہ نشین فقیروں کے یہاں بھی مشکل سے ہے، تاریخ اسلام کے ہر دور اور عالم اسلام کے ہر گوشہ میں ایسی شخصیتیں ملتی ہیں کہ بقول اقبالؔ ؎

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب

سلطنتِ اہل دیں فقر ہے شاہی نہیں

"مدرسۂ نبوت" کے ان فیض یافتہ سلاطین میں جن کی فہرست طویل ہے آپ صرف سلطان صلاح الدین ایوبی کا حال پڑھیں، چھٹی صدی ہجری میں مشرق وسطیٰ کے اس سب سے بڑے حکمراں (جو کردستان کے پہاڑوں سے لے کر صحرائے نوبہ تک حکومت کرتا تھا) کے متعلق اس کا سکریٹری قاضی ابن شداد شہادت دیتا ہے۔

"زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت نہیں آئی، اس لئے کہ انھوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا، جس پر زکوٰۃ فرض ہو، ان کی ساری دولت صدقات و خیرات میں خرچ ہوئی، صرف سینتالیس درہم ناصری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائداد و ملکیت، کوئی مکان، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے

صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھاس کے پولے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔[1]

انسانی بلندی، شرافتِ نفس، عالی حوصلگی کے اعتبار سے بھی سلطان تاریخ کے عظیم ترین انسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر عیسائی فاتحین کے برخلاف (جنھوں نے ظلم و سفاکی کی ایک نظیر قائم کردی تھی) سلطان نے جس شفقت و مرحمت اور جس احسان و فیاضی کا مظاہرہ کیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے ان کا مغربی سوانح نگار اسٹنلی لین پول (STANELEY LANE POOL) لکھتا ہے :۔

"اگر سلطان صلاح الدین کے کارناموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شہامت میں یکتا اور بے مثل شخص تھا۔"[2]

آپ نے جہاں مشرق وسطیٰ کے ایک عظیم الشان حکمراں کے احسان و فیاضی کا واقعہ سنا، خود اپنے ملک کے ایک مسلمان بادشاہ کا واقعہ بھی سنتے چلئے، جو خلوص و فیاضی، ایثار اور بلند حوصلگی کا ایک اور نمونہ ہے، یہ دسویں صدی ہجری کے ایک طاقت ور فرماں روا مظفر حلیم سلطان گجرات (م ۹۳۲ھ) کا واقعہ ہے کہ جس نے محمود شاہ خلجی کی مدد کے لئے (جو غاصبوں کے ہاتھوں تخت و تاج سے محروم ہو گیا تھا اور اس کی سلطنت پر اس کے نمک خواروں نے قبضہ کر لیا تھا) مانڈو پر حملہ کیا تھا اور اس کو فتح کر لیا تھا، واقعہ مؤرخِ گجرات کی زبان سے سنئے :۔

"تسخیر قلعہ کے بعد جس وقت مظفر حلیم اندر داخل ہوا اور امرائے ہمرکاب نے شاہانِ مالوہ

---

[1] النوادر السلطانیہ [2] سلطان صلاح الدین ص۲۰۵

کے سامان تجمل اور خزائن ودفائن کو ملاحظہ کیا اور اس ملک کی سرسبزی و شادابی پر اطلاع پائی تو انھوں نے جسارت کرکے مظفر شاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار سوار جرار درجۂ شہادت کو پہونچ چکے ہیں، یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے بعد پھر ملک کو اسی بادشاہ کے حوالہ کر دیا جائے جس کی سوء تدبیری سے مندلی رائے نے اس پر قابو پالیا تھا، بادشاہ نے یہ سنتے ہی سیر موقوف کی اور قلعہ سے باہر نکل کر محمود شاہ کو ہدایت فرمائی کہ اس کے ہمرکابیوں میں سے کسی کو قلعہ کے اندر نہ جانے دے، محمود نے باصرار تمام اس بات کی التجا کی کہ بادشاہ چند روز قلعہ کے اندر آرام فرمائیں، مگر مظفر شاہ نے اس التجا کو قبول نہ فرمایا اور بعد کو خود ظاہر کیا کہ میں نے یہ جہاد محض خداوند برحق کی رضامندی حاصل کرنے کو کیا تھا، مجھ کو امراء کی تقریر سے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ مبادا کوئی خطرہ فاسد میرے دل میں پیدا ہو اور میرا خلوص نیت برباد ہو جائے، میں نے محمود پر کچھ احسان نہیں کیا، بلکہ خود محمود کا مجھ پر احسان ہے کہ اس کی وجہ سے مجھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی"۔[1]

میں یہ نہیں کہتا کہ سارے سلاطین و فرماں روا جو اسلامی عہد میں گزرے وہ نور الدینؒ صلاح الدینؒ ناصر الدین محمود اور سلطان مظفر حلیم کا نمونہ تھے لیکن آپ کو جن فرماں رواؤں میں انسانی بلندی، خدا ترسی، فقر و زہد، ایثار و قربانی اور شفقت و مرحمت کی یہ شان نظر آتی ہے اور ان میں سے جو اپنے زمانہ کی سطح سے بلند، بادشاہوں کی روایات سے الگ اور زمانے سے نرالے دکھائی دیتے ہیں، وہ صرف نبوت کے فیض اور دینی جذبہ کا نتیجہ ہیں، آپ اگر ان کی زندگی اور سوانح حیات کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو سراغ لگانے میں دقت نہیں ہوگی کہ ان سب کا تعلق و اتصال (تعلیم و تربیت، تعلق و محبت، اتباع و اطاعت کے ذریعہ سے) اسی ایک سرچشمۂ ہدایت سے تھا جس نے ہر دور میں عظیم ترین انسان پیدا کئے

---

[1] یاد ایام بحوالہ مرآۃ سکندری۔

خواہ ان کا زمانہ کتنا ہی دور ہو، دراصل یہ سب اسی درسگاہِ نبوت کے فیض یافتہ ہیں جس نے تعمیرِ انسانیت کا کام سب سے وسیع پیمانہ پر اور سب سے اعلیٰ سطح پر انجام دیا اور جس کا فیض اب بھی انسانیت کے چراغ کو روشن کئے ہوئے ہے اور جہاں کہیں روشنی ہے، اسی ایک چراغ کا پرتو ہے ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

ہماری جدید تہذیب اور موجودہ فکری قیادت، معاشرۂ انسانی کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد تیار کرنے اور انسان کی سیرت سازی میں بری طرح ناکام رہی ہے، وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتی ہے، وہ خلا میں سفر کرنے کے لئے محفوظ و سریع السیر آلات تیار کر سکتی ہے، وہ انسان کو چاند اور سیاروں پر پہونچا سکتی ہے، وہ ذراتی طاقت سے بڑے بڑے کام لے سکتی ہے، وہ ملک سے غریبی دور کر سکتی ہے، وہ علم و ہنر کو آخری نقطۂ عروج پر پہونچا سکتی ہے، وہ پوری کی پوری قوم اور ایک ملک کی آبادی کو خواندہ و تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے، اس کی ان کامیابیوں اور فتوحات سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں، لیکن وہ صالح اور صاحبِ یقین افراد پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی ناکامی اور بدقسمتی ہے، اور اسی وجہ سے صدیوں کی محنتیں ضائع و برباد ہو رہی ہیں، اور ساری دنیا مایوسی اور انتشار کا شکار ہے، اور اب اس کا سائنس اور علم پر سے بھی اعتقاد اٹھ رہا ہے، اندیشہ ہے کہ دنیا میں ایک شدید ردِ عمل کی تحریک اور علم و تمدن کے خلاف بغاوت کے دور کا آغاز نہ ہو جائے، فاسد افراد نے معصوم اور صالح وسائل و ذرائع کو بھی فاسد بلکہ آلۂ فساد و تخریب بنا دیا ہے، فاسد و کمزور تختوں سے کوئی صالح اور مضبوط سفینہ تیار نہیں ہو سکتا، یہ بالکل مغالطہ اور خام خیالی ہے کہ فاسد تختے علیحدہ علیحدہ فاسد کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہیں لیکن جب ان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے، اور ان سے کوئی سفینہ تیار کیا جائے تو ان کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے،

اور وہ صالح بن جاتے ہیں، رہزن اور چور علیحدہ علیحدہ تو رہزن اور چور ہیں، لیکن جب وہ اپنی جماعت بنا لیں تو وہ پاسبانوں اور ذمہ دار انسانوں کی ایک مقدس جماعت ہے، نئی فکری قیادت نے جو افراد دنیا کو عطا کئے ہیں وہ ایمان و یقین سے خالی، ضمیر انسانی سے عاری، حاسّۂ اخلاقی سے محروم، محبت و خلوص کے مفہوم سے ناآشنا، انسانیت کے شرف و احترام سے غافل ہیں، وہ تو لذت و عزّت کے فلسفہ سے واقف ہیں یا صرف قوم پرستی اور وطن دوستی کے مفہوم سے آشنا ہیں، اس نوعیت اور صلاحیت کے افراد خواہ جمہوری نظام کے سربراہ ہوں یا اشتراکی نظام کے ذمہ دار کبھی کوئی صالح معاشرہ، پرامن ماحول اور خدا ترس و پاکباز سوسائٹی قائم نہیں کر سکتے اور ان پر خدا کی مخلوق اور انسانی کنبہ کی قسمت کے بارے میں کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اس دنیا میں صالح ترین افراد اور صالح ترین معاشرہ صرف نبوت نے تیار کیا ہے، اور اسی کے پاس قلب کو بدلنے اور گرمانے، نفس کو جھکانے اور جانے، نیکی و پاکبازی کی محبت اور گناہ اور بدی سے نفرت پیدا کرنے، مال و زر، ملک و سلطنت، عزت و وجاہت اور ریاست و تفوّق کی سحر انگیز ترغیبات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اور وہی افراد جو ان صلاحیتوں کے مالک ہوں، دنیا کو ہلاکت سے اور تہذیب جدید کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔

نبوت نے دنیا کو سائنس نہیں دی، ایجادیں نہیں عطا کیں، اس کو نہ اس کا دعویٰ ہے، نہ ایسا نہ کرنے پر شرمندگی اور معذرت، اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کو وہ افراد عطا کئے جو خود صحیح راستے پر چل سکتے ہیں، اور دنیا کو چلا سکتے ہیں اور ہر اچھی چیز سے خود نفع اٹھا سکتے ہیں، اور دوسروں کو پہونچا سکتے ہیں، اور جو ہر قوت اور نعمت کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں، جو اپنی زندگی کے مقصد سے واقف اور اپنے پیدا کرنے والے سے آشنا ہیں، اور اس کی ذات سے استفادہ کرنے اور اس سے مزید نعمتیں حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، انھیں کا وجود اصل انسانیت کا سرمایہ اور انھیں کی تربیت نبوت کا اصل کارنامہ ہے۔

نبوّت کا عطیہ[1]

دنیا کی تاریخ میں کثرت سے ایسے افراد اور جماعتیں گزری ہیں، جنھوں نے انسانیت کی خدمت کی ہے، اور دنیا کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا ہے، اس موقع پر وہ سب تاریخ کی سطح سے ابھر آتے ہیں اور اپنے کو انسانیت کا معمار و خدمت گزار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور وہ امیدوار ہوتے ہیں کہ ان کو بھی اس معیار سے جانچا اور پرکھا جائے گا، یہ ٹھیک ہے، ان کو بھی موقع دینا چاہیے، اور ان کی خدمات و احسانات کا موازنہ کرنا چاہیے پھر فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے ایک سنجیدہ اور باوقار گروہ آتا ہے، یہ حکماء و فلاسفر کی جماعت ہے، ان میں یونان کے بڑے بڑے فلسفی بھی ہیں، اور ہندوستان کے بلند پایہ حکیم بھی، ہمارا ذہن حکمت و فلسفہ سے شروع سے مرعوب رہا ہے ہم ان کو دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں کہ انھوں نے انسانیت کا سر اونچا کیا ہے، اور اس کا دامن حکمت کے موتیوں سے بھر دیا ہے لیکن تعصبات اور عقیدت مندی سے ذرا آزاد ہو کر غور کیجیے، کہ کیا ان کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے، اور کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ

---

[1] یہ تقریر ماہ ربیع الاول ۱۳۷۴ھ مطابق نومبر ۱۹۵۴ء کو امین الدولہ پارک لکھنؤ کے جلسۂ عام میں کی گئی جس میں خاصی تعداد میں غیر مسلم شریک تھے، تقریر اسی وقت قلمبند کر لی گئی تھی، بعد میں معمولی ترمیم و اضافہ کیا گیا۔

وہ انسانیت کے حق میں رحمت ثابت ہوئے ہیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ انسانیت نے ان سے کیا پایا اس کی کون سی پیاس بجھی، انھوں نے اس کے کس درد کا مداوا کیا؟ غور کرنے پر ہم کو مایوسی ہوتی ہے! ذرا آپ فلسفہ کا مطالعہ کیجئے اور فلاسفہ کی زندگی پر نظر ڈالئے، صاف معلوم ہوگا کہ فلسفہ زندگی کے سمندر میں ایک مختصر سا جزیرہ تھا ایک محفوظ جگہ تھی، ایک محدود دائرہ تھا، یہ حکماء و فلاسفہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اور خدا کی دی ہوئی طاقتیں اس محدود دائرے کے اندر صرف کر رہے تھے، انسانیت کے وہ مسائل جن کو ذرا دیر کے لئے بھی ٹالا نہیں جا سکتا اور جو فوری حل کے محتاج ہیں، جن کے بغیر انسانیت کی گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکتی، ان حکماء نے نہ ان مسائل کو چھیڑا نہ ان سے بحث کی اور نہ ان مسائل میں انسانیت کی کوئی مدد کی، وہ اپنے اس علمی جزیرہ کے اندر عافیت کی زندگی گزارتے رہے، لیکن انسانیت تو ان چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بند نہیں تھی، یونان جہاں فلاسفہ بہت گزرے ہیں، اس یونان میں بھی سارے کے سارے فلسفی ہی تو نہیں تھے، ان فلسفیوں نے کواکب و سیارات سے تو بحث کی اور فلکیات پر موشگافیاں کیں، مگر زندگی کے لئے کیا ہدایات دیں اور علمی طبقہ کو چھوڑ کر دوسرے طبقات کی کیا رہنمائی کی؟ انھوں نے بھٹکتی ہوئی انسانیت اور سسکتی ہوئی زندگی کے لئے کیا کیا؟ وہ زندگی میں رہتے ہوئے بھی زندگی سے بے تعلق تھے، انھوں نے اپنے گرد علم و حکمت کا ایسا حصار کھینچ لیا تھا، اور صرف چند علمی مسائل سے تعلق رکھا تھا۔

یہ ایک سیاسی دور ہے اور ہمارا ملک اب آزاد ہے، شاید آپ اس مثال سے فلاسفہ کی صحیح پوزیشن سمجھ سکیں، دیکھئے آپ کے ملک میں مختلف بیرونی ممالک کے سفارت خانے ہیں، کوئی امریکی سفارت خانہ ہے، کوئی روسی سفارت خانہ ہے، کوئی مصر کا ہے، کوئی ایران کا، ان سفارت خانوں کے اندر بھی زندگی اور حرکت ہے، ان کے اندر بھی بہت سے لوگ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں، بڑے بڑے فاضل اور سیاسی مبصر بھی ہیں، لیکن ان کو ہمارے ملک کے اندرونی مسائل سے کوئی تعلق نہیں، ہمارے آپس کے تعلقات اور باہمی کشاکش سے کوئی واسطہ

نہیں، یہاں کی غریبی، امیری، اخلاقی ترقی و انحطاط سے ان کو بحث نہیں، ان کا ایک محدود و مخصوص کام ہے اور وہ صرف وہی کام انجام دیتے ہیں، اس لئے وہ یہاں ہو کر بھی ایسے ہیں گویا وہ یہاں نہیں ہیں، بس اسی طرح حکمت و فلسفہ ایک غیر ملکی سفارت خانہ کی طرح قائم تھا، اور یہ حکماء و فلاسفہ ان سفارت خانوں کی چار دیواری کے اندر علم و حکمت کی نمائندگی کر رہے تھے، اور زندگی کے مسائل سے بے تعلق تھے۔

دوسری جماعت جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ ادباء و شعراء کی جماعت ہے ہم کو اور آپ کو ادب و شاعری کا ذوق ہے اور ہم ادب و شعر کی تحقیر نہیں کرتے لیکن بے ادبی نہ تھا! کہ ادباء و شعراء نے بھی انسانیت کے دکھ کا علاج نہیں کیا، انھوں نے ہمارے لئے تفریح کا سامان بہم پہونچایا، ہمارے ادب و زبان کو مالا مال کیا لیکن انسانیت کی اصلاح کا درد سر مول نہیں لیا اور نہ یہ ان کے بس کی بات تھی، زندگی بنتی اور بگڑتی رہی، انسانیت گرتی اور سنبھلتی رہی اور یہ اپنے میٹھے میٹھے بول سناتے رہے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ لوگ اپنی اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہوں، کہیں لڑائی جھگڑا ہو رہا ہو، کہیں زندگی کے مسائل درپیش ہوں، اور کوئی بانسری بجانے والا بڑی سریلی آواز میں بانسری بجاتا گزر جائے، آپ تھوڑی دیر کے لئے اس کا لطف لے سکتے ہیں، آپ اس کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، مگر اس ترنم سے آپ زندگی کے مسائل تو حل نہیں کر سکتے، اور نہ اس سے کوئی پیغام حاصل کر سکتے ہیں، شعر و ادب ہماری زندگی کے لئے کتنے ہی ضروری سہی اور اس سے ہماری روح کی بالیدگی اور اس سے ہمارے دماغ کو کیسی ہی تازگی حاصل ہو لیکن ہمارے مسائل کا حل اور ہمارے درد کی دوا تو نہیں، پھر ان ادباء و شعراء کو کسی چیز پر اصرار بھی نہیں تھا، وہ کسی مقصد کے لئے جد و جہد بھی نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے لئے قربانیاں کرنا ان کے بس کی بات تھی، اور اصلاح و انقلاب اس کے بغیر ہوا نہیں کرتا۔

تیسرا گروہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ فاتحین کا ہے جنھوں نے ملکوں کو فتح کیا اور اپنے زورِ شمشیر سے قوموں کو تسخیر کیا، اس گروہ سے بھی ہم اچھے خاصے مرعوب ہیں، ان کی تلواروں کی جھنکار ابھی تک ہمارے کانوں میں آرہی ہے، بظاہر ان کے شور سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کی بڑی خدمت کی، مگر ان کے نام کے ساتھ کون سی تاریخ وابستہ ہے؟ کیا عدل وانصاف کی، یاد رندگی وسفاکی کی؟ سکندر کا نام آتا ہے تو اس کے مظالم کی داستان تازہ ہو جاتی ہے کیا وہ انسانیت کا محسن تھا؟ اس نے یونان سے ہندوستان تک تمام ملکوں کو زیروزبر کر دیا، ملک کے ملک اس کی وجہ سے امن واماں اور زندگی کے لطف سے محروم ہو گئے، اس کے چلے جانے کے بعد بھی سیکڑوں برس تک یہ ملک سنبھل نہ سکے، یہی حال سیزر، چنگیز خاں اور دوسرے بڑے بڑے فاتحین کا ہے، فاتح چاہے اپنے ملک کا محسن ہو یا اپنی قوم کے لئے رحمت ہو مگر دوسری قوموں اور ملکوں کے لئے عذاب اور مصیبت ہے۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا آتا ہے جو ملک کے آزاد کرانے والے ہیں اور قومی لیڈر ہیں، اس گروہ کا جب نام آتا ہے تو احترام سے ہماری گردنیں جھک جاتی ہیں، حقیقتاً انھوں نے اپنے ملک کے لئے بڑا کام کیا، مگر اس ملک کے باہر بسنے والے انسانوں کے لئے کیا کیا؟ آپ ابراہیم لنکن کے نام سے واقف ہوں گے، وہ جدید امریکہ کا معمار ہے، مگر بتایئے ہندوستان، مصر وعراق اور ان جیسے اور ملکوں کو اس سے کیا فائدہ پہونچا؟ نتائج پر نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس نے ایک امپیریلسٹ طاقت پیدا کر دی اور دنیا کی غلامی کی زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیا، سعد زاغلول کون تھا؟ مصر کا محسن اور وہاں کی تحریک آزادی کا سب سے مشہور رہنما، مگر مصر سے باہر اس نے کیا کیا اور اس کا ہم پر کیا احسان ہے؟ یہ قوم پرستی تو دراصل دوسرے ملکوں اور قوموں کے لئے مصیبت ہے، اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی اپنی قوم کی برتری اور دوسری قوموں کی تحقیر پر ہے اور اکثر اس کو

اپنی قوم کا پایہ بلند کرنے کے لئے دوسری قوموں کو غلام بنانا پڑتا ہے۔

پانچواں گروہ وہ ہے جو سائنٹسٹ کہلاتا ہے جس نے نئی نئی ایجادیں کیں اور بہت سی کارآمد چیزیں بنائیں، بلاشبہہ اس گروہ نے انسانوں کی بڑی خدمت کی، یہ تمام ایجادیں جو ہمارے کام آتی ہیں، جیسے بجلی، ہوائی جہاز، ریل اور ریڈیو انھیں سائنٹسٹ حضرات کی مرہون منت ہے، اس کے لئے انھوں نے بڑی محنتیں کیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ انسانوں کے بڑے کام آتی ہیں مگر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ ایجادیں تنہا کافی نہیں، ان ایجادوں کے ساتھ اگر نیک ارادے نہ ہوں، صبر و ضبط نہ ہو، خدمت خلق کا جذبہ نہ ہو، اس سے اگر انسانیت کے ضروری مسائل حل نہ ہوں تو بتایئے کہ یہ ایجادیں انسانیت کے لئے رحمت ہیں یا زحمت؟ انھوں نے یہ ایجادیں تو انسان کو دے دیں مگر ان کے استعمال کا صحیح جذبہ نہیں دیا، وہ ذہن وضمیر نہیں پیدا کیا جو ان سے فائدہ اٹھائے اور ان کو ٹھکانے لگائے اور ان سے غلط کام لینے سے پرہیز کرے گزشتہ دو جنگوں کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور خدا ترسی کے بغیر یہ ایجادیں اور یہ وسائل انسانیت کے حق میں قہر و عذاب ہیں، رحمت و راحت نہیں، میں ان سائنس والوں کی تحقیر نہیں کرتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ایجاد کا کارنامہ نیک مقاصد، اخلاقی طاقت اور دماغی توازن کے بغیر مکمل نہیں، ادھورا ہے، جب تک انسان کے دل میں نیک خواہش نہ ہو اور خود اس کے اندر نیک کام کرنے کی تحریک اور تقاضا نہ پیدا ہو، اس کو وسائل و آلات، مواقع و امکانات اور سہولتیں اور آسانیاں نیک نہیں بنا سکتیں، فرض کیجئے، میرے پاس دینے کو روپیہ بھی ہے، لینے کے لئے بہت سے محتاج بھی ہیں، میرا کوئی ہاتھ نہیں پکڑتا مگر میرے اندر فیاضی کا جذبہ اور مدد کرنے کی خواہش نہیں تو مجھے کون دینے پر آمادہ کرسکتا ہے؟

اب ایک دوسرا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے، یہ پیغمبروں کا گروہ ہے، یہ گروہ ایجاد و

انکشافات کا دعویٰ نہیں کرتا نہ وہ علوم میں مہارت کا مدعی ہے نہ اس کو ادب و شاعری پر ناز ہے وہ اپنے متعلق نہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں نہ بے ضرورت خاکساری سے، وہ بڑی صفائی اور سادگی سے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کو تین چیزیں عطا کرتے ہیں۔ (۱) صحیح علم (۲) اس علم پر یقین۔ (۳) اس علم پر عمل کرنے اور اس یقین کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ اور خواہش، یہ ہے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک کی تعلیم کا نچوڑ۔

اب میں بتاتا ہوں کہ وہ صحیح علم کیا ہے جو پیغمبر انسانوں کو دیتے ہیں، وہ علم اس کا کہ دنیا کو کس نے بنایا اور کس لئے بنایا، پیغمبر کہتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم کو کس نے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا، اس کے معلوم کئے بغیر ہمارا ہر قدم غلط ہے ہم کو اس دنیا کی کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں، اس لئے کہ اس زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے چلنا پھرنا، کھانا پینا، وہ سب اسی عظیم کُل کا ایک حقیر جزء ہے، جب تک کہ ہم کو اس کائنات کا مرکز معلوم نہیں اور ہم اس کے مقصدِ کلی سے اتفاق نہیں رکھتے، ہم کو اس کے اجزاء سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ اس کے بغیر تو روٹی کا ایک ٹکڑا توڑنا حرام ہے، ہم بھی اس کائنات کا ایک حقیر جزء ہیں، اور غلہ کا جو دانہ ہم استعمال کرتے ہیں، وہ بھی اس مجموعہ کی ایک بہت حقیر کسر اور ایک ادنیٰ ذرہ ہے، بلکہ ہم جس سیارہ (زمین) پر بس رہے ہیں، وہ بھی اس کائنات کا حقیر ذرہ ہے، ہماری اس زمین کی اس نظام فلکی میں کیا حیثیت ہے؟ اگر آپ کو وہ نسبت معلوم ہو جائے جو آپ کی اس زمین اور سورج کے درمیان ہے یا دوسرے سیاروں اور ثوابت سے ہے تو آپ کو اپنے وجود سے بھی شرم آنے لگے گی اور اپنے عظیم الشان وطن سے بھی، آپ کے اور اس کائنات کے دوسرے جزء کے درمیان کس نے ربط پیدا کیا؟ اسی خالق کائنات نے اور اسی مقصد کلی نے! اگر آپ اس خالق کائنات کو نہیں جانتے یا نہیں مانتے اور اس مقصد کلی سے آپ کو اتفاق نہیں ہے تو آپ کو اس کائنات کے کسی ذرہ یا دوسرے جزء سے فائدہ اٹھانے کا

کیا حق ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اگر روٹی کا وہ ٹکڑا جو آپ کے ہاتھ میں ہے آپ سے سوال کرے کہ میں نے
تو اپنے خالق کو پہچان لیا اور اس کے حکم کے مطابق میں نے اپنے مخدوم (انسان) کے لئے اپنے وجود کو
قربان کر دیا لیکن اے انسان! تو نے نہ اپنے خالق کو جانا نہ اس کی بندگی کی، تجھے مجھ سے فائدہ اٹھانے
کا کیا حق ہے؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟! اسی طرح اس دنیا کی کسی چیز کا استعمال غلط ہے جب تک یہ
جان نہ لیا جائے کہ اس کا پیدا کرنے والا کون ہے، اور اس کا مقصد کیا ہے، مگر یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ
آج دنیا میں تمام کام ہو رہے ہیں، بازار میں چہل پہل ہے، تعلقات قائم ہو رہے ہیں، سواریاں چل رہی
ہیں، بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں، مگر کسی کو یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں کہ جس دنیا میں یہ سب کچھ ہو رہا
ہے اس کا پیدا کرنے والا کون ہے، اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ جب پیغمبر دنیا میں تشریف لائے
انسانیت کی گاڑی بے مقصد جا رہی تھی، فلاسفہ، علماء، ادباء، شعراء، فاتحین، حکمرانوں، کاشتکاروں
اور تاجروں کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی، حاکم بھی تھے، اور محکوم بھی تھے، ظالم بھی تھے، اور مظلوم
بھی تھے، مگر سب اصل مقصد سے غافل اور اپنے پیدا کرنے والے سے ناواقف، ان چھوٹے چھوٹے
بالشتی جیسے انسانوں میں ایک بلند قامت انسان آتا ہے، اور جن لوگوں کے ہاتھ میں انسانیت کی
باگ ڈور تھی، ان سے سوال کرتا ہے کہ جواب دو کہ تم نے انسانوں پر یہ کیا ظلم کیا ہے کہ ان کو اپنے
مالک اور اس دنیا کے بادشاہ سے ہٹا کر اپنا غلام بنا لیا ہے، تم کو کیا حق تھا کہ نابالغ انسانیت کا
ہاتھ پکڑ کر تم نے اس کو غلط راستہ پر ڈال دیا ہے، اے ظالم ڈرائیور تو نے مسافروں سے پوچھے بغیر
زندگی کی گاڑی کس طرف چلانی شروع کر دی، وہ زندگی کے قلب و ضمیر میں کھڑے ہو کر انسانیت
کو خطاب کرتا ہے، اور اس کو پکارتا ہے، اس کے سوال کو ٹالا نہیں جا سکتا، اس کی دعوت اور
اس کی پکار پر دو گروہ ہو جاتے ہیں، ایک اس کی بات مانتا ہے، ایک انکار کرتا ہے، دنیا کو ان
دونوں راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

پیغمبر کبھی نہیں کہتے کہ ہم قدرت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرنے آئے ہیں، ہم طبعی طاقتوں کو مسخر کرنے آئے ہیں، ہم کچھ نئی ایجادیں کریں گے، وہ جغرافیہ و معدنیات میں مہارت کا دعویٰ نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا کے بنانے والے اور اس کی ذات و صفات کا صحیح علم عطا کرتے ہیں جو ہم کو اس دنیا کے مالک نے اور انسان کے خالق نے عطا کیا ہے اور اب ہمارے ہی ذریعے سے وہ دوسروں کو مل سکتا ہے۔

وہ بتاتے ہیں کہ اس دنیا کا بنانے والا ایک ہے اور اسی کی مرضی و حکمت سے یہ دنیا چل رہی ہے، وہ بلا شرکت غیرے اس کو چلا رہا ہے، یہ دنیا بے مقصد نہیں پیدا کی گئی اور نہ بے مقصد چل رہی ہے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہوگی جس میں اس پہلی زندگی کا حساب دینا ہوگا، وہاں اچھے اعمال کا انعام ملے گا، برُے اعمال کی سزا ملے گی، قانون لانے والے اور خدا کا منشا بتلانے والے پیغمبر ہیں، جو ہر ملک اور ہر قوم میں آئے اور خدا کا پیغام لائے، خدا کا راستہ ان کے بغیر طے نہیں ہو سکتا یہ وہ باتیں ہیں، جن پر تمام پیغمبر متفق ہیں، ان میں کسی کا اختلاف نہیں، فلاسفہ و حکماء میں سخت اختلاف ہے، ان میں سے دو بھی کسی ایک بات پر متفق نہیں لیکن یہاں کسی ایک بات پر بھی دو پیغمبروں میں اختلاف نہیں۔

لیکن علم کے لئے یقین ضروری نہیں، آج ہمارے معلومات کتنے زیادہ ہیں مگر ہمارا یقین کتنا کم ہے، علم ہمیشہ یقین پیدا نہیں کرتا، قدیم زمانہ کے فلاسفہ میں سے بہت سے یقین سے محروم تھے اور شک کے مریض، آج بھی ان کا علم یقین پیدا کرنے کے بجائے الٹا شک پیدا کرتا ہے، آج بھی بڑے بڑے صاحب علم یقین کو ترستے ہیں، انبیاء علیہم السلام تنہا صحیح علم نہیں دیتے تھے اس پر یقین بھی عطا کرتے تھے، علم بڑی دولت ہے، مگر اس پر یقین اس سے بڑی دولت ہے، علم بغیر یقین کے زبان کی ورزش ہے، دماغ کا تعیش اور دل کا نفاق، پیغمبروں نے اپنے ماننے والوں کو

صحیح علم عطا کیا اور مضبوط یقین، انھوں نے جو کچھ جانا اس کو مانا پھر اپنے کو اس پر قربان کر دیا، ان کے دماغ اس علم سے روشن ہوئے اور ان کے دل اس یقین سے طاقتور، ان کے یقین کے قصے تاریخ میں پڑھئے، ان کے یقین کے نتائج اپنی گرد و پیش کی دنیا میں دیکھئے۔

آج اگر یقین ہوتا تو بد اخلاقی کیوں ہوتی؟ ظلم کیوں پھیلتا؟ رشوت کا بازار کیوں گرم ہوتا؟ کیا یہ تمام خرابیاں اس لئے ہیں کہ علم نہیں، لوگوں کو معلوم نہیں کہ چوری جرم ہے؟ رشوت حرام ہے، گرہ کٹی بد اخلاقی ہے، یہ کون کہہ سکتا ہے؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جہاں علم زیادہ ہے، وہاں خرابیاں بھی زیادہ ہیں، جو لوگ رشوت کی بُرائی پر کتاب لکھ سکتے ہیں، اور اس کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں، وہ زیادہ رشوت لیتے ہیں، جو چوری کی خرابی سے اور اس کے انجام سے زیادہ واقف ہیں، وہ چوری زیادہ کرتے ہیں، گرہ کٹوں کو دیکھئے ان میں سے بہت سے ایسے ملیں گے جو گرہ کٹی کے الزام میں کئی کئی بار سزا بھگتے ہوئے ہوتے ہیں، کیا ان سے زیادہ کوئی گرہ کٹی کے انجام اور سزا سے واقف ہوگا، اگر صرف علم کافی ہوتا تو چوری کی سزا کے بعد چوری چھوٹ جاتی اور ایک بار جرم کرنے کے بعد اور سزا بھگتنے کے بعد کوئی دوبارہ جرم نہ کرتا لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے، معلوم ہوا علم تنہا کافی نہیں۔

پھر علم ضروری اور یقین ضروری مگر اس کی کیا ضمانت کہ اس پر عمل کا تقاضا بھی پیدا ہوگا، بہت سے لوگ جانتے بھی ہیں اور یقین بھی رکھتے ہیں کہ شراب بُری چیز ہے، اس کے نقصانات کا تجربہ بھی ہے، یقین بھی، مگر پیتے ہیں، آپ کے شہر میں بہت سے ڈاکٹر حکیم ہوں گے جو بد پرہیزی کرتے ہیں، ان کو یقین ہوتا ہے کہ بد پرہیزی خطرناک ہے مگر وہ بد پرہیزی کر گزرتے ہیں، بات یہ ہے کہ عمل کا تقاضا نہیں ہوتا اور ان کے اندر پرہیز کی خواہش اور بد پرہیزی سے نفرت نہیں ہوتی، بلکہ بد پرہیزی کی خواہش ہوتی ہے، اور وہ اس خواہش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

انبیاء کرام علم ویقین کے ساتھ یہ تیسری طاقت بھی عطا کرتے ہیں، یعنی اپنے علم ویقین پر عمل کرنے کی رغبت اور اپنی غلط خواہشات کا مقابلہ کرنے کی طاقت، اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم ویقین سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، ان کا ضمیر ان کی نگرانی کرتا ہے، اور غلط کام کرنے کے وقت ان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

ہر پیغمبر نے یہ تینوں دولتیں اپنے اپنے زمانہ والوں اور اپنی اپنی اُمتوں کو عطا کیں اور ان کی بدولت لاکھوں انسانوں کی زندگی بن گئی اور زندگی کی چول اپنی جگہ پر آگئی، انسانیت پر حقیقی احسان انھیں پیغمبروں کا ہے، اللہ کا درود وسلام ہو ان پر کہ انھوں نے انسانیت کی دستگیری کی اور اس کو عین وقت پر ہلاکت سے بچالیا۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ دولتیں دنیا سے ناپید ہونے لگیں، علم صحیح گم ہوگیا، یقین کا چراغ بجھ گیا، نیک عمل کی خواہش مردہ ہوگئی، چھٹی صدی مسیحی آئی تو یہ تینوں دولتیں اتنی نایاب ہو چکی تھیں کہ ان کا سراغ لگانا مشکل تھا، پورے پورے ملک اور پورے پورے براعظم میں ڈھونڈھنے سے بھی ایک اللہ کا بندہ نہ ملتا جو علم صحیح اور ایمان قوی کی دولت سے مالا مال ہو، انبیاء کا لایا ہوا دین اور پھیلایا ہوا یقین سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ بن گیا تھا، شک و بے عملی کی ظلمتوں میں علم ویقین کا یہ نور اس طرح کہیں کہیں چمکتا تھا جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں، اہل یقین کا ایسا قحط تھا کہ ایران کا ایک نوجوان سلمان فارسی یقین اور حسن عمل کی تلاش میں نکلتا ہے تو ایران سے شام اور وہاں سے حجاز پہونچ جاتا ہے، اور ان تین ملکوں میں اس کو صرف چار صاحب یقین ملتے ہیں۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے اور اس عالمگیر ظلمت میں خدا کا آخری پیغمبر آتا ہے، وہ ان تینوں دولتوں کو اتنا عام کر دیتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنی عام نہیں ہوئی تھیں، جو دولت کسی کسی سینہ اور کسی کسی سفینہ میں تھی، جو گھروں سے نکل کر محلوں میں بھی اور محلوں سے نکل کر شہروں میں بھی

نہیں پھیلی تھی، وہ گھر گھر عام ہو جاتی ہے اور مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جاتی ہے۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

وہ ان تینوں حقیقتوں کی تلقین ہی نہیں کرتا، ان کا صور پھونک دیتا ہے، دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی کان والا ایسا نہیں جو کہہ سکے کہ اس نے اس صور کی آواز نہیں سنی اور جس نے نہیں سنی اس کے کان کا قصور ہے، اس کے اعلان کا قصور نہیں، آج دنیا کا کون سا گوشہ ہے جہاں "اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ" اور "اشہد ان محمداً رسول اللّٰہ" کا ترانہ سننے میں نہیں آتا، جب دنیا کی تمام آوازیں تھک کر سو جاتی ہیں، جب جیتے جاگتے شہر پر موت کی سی نیند طاری ہو جاتی ہے، جب زبانوں پر قفل پڑ جاتے ہیں، اس وقت بھی کانوں میں یہی صدا آتی ہے کہ "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد رسول اللہ، اللہ کے پیغمبر ہیں"!

آج ریڈیو کے ذریعہ دنیا کے کونہ کونہ میں آواز پہونچتی ہے اور گھر گھر پیغام پہونچ جاتا ہے، لیکن کیا کسی ریڈیو نے خواہ وہ امریکہ کا ہو خواہ برطانیہ عظمیٰ کا، کسی حقیقت کو کسی علم کو اس طرح دنیا میں عام کیا ہے، جس طرح یہ علم عام ہوا ہے، جس کی صدا عرب کے نبی اُمّی نے کوہِ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر لگائی تھی؟!

انسان کبھی ترنگ میں آتا ہے اور طفلانہ معصومیت کے ساتھ اپنے مالک سے کچھ کہنے لگتا ہے ایسی ہی ترنگ میں اقبالؔ نے انسانوں کی طرف سے اپنے مالک کی بارگاہ میں عرض کیا تھا۔

ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

اگر آج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ غلام عرض کرے تو کیا بیجا ہے کہ خدایا تیری خدائی برحق! تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خالق اور اس ساری دنیا کا خالق و مالک اور ہر شئے پر قادر ہے! لیکن کیا تیرے بندوں اور تیری مخلوقات میں سے کسی نے تیرا نام اس طرح

پھیلایا اور دنیا کے کونہ کونہ میں پہونچایا جس طرح تیرے بندے اور پیغمبر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ؟ یہ کوئی بے ادبی اور سرکشی نہیں، اس میں بھی تعریف اسی خدا کی ہے، جس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جیسا پیغمبر بھیجا اور ان کو اپنا نام پھیلانے اور اپنا دین چمکانے کی یہ طاقت اور توفیق عطا فرمائی!

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کے میدان میں جب اپنی ۱۴-۱۵ سال کی کمائی اللہ کے دین کی مدد کے لئے سامنے رکھ دی اور ۳۱۳ کو ایک ہزار کے مقابلہ میں لاکر کھڑا کر دیا تو زمین پر سر رکھ کر اپنے مالک سے یہی کہا تھا کہ " اے اللہ اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو آج ہلاک کر دینے کا فیصلہ فرماتا ہے تو قیامت تک تیری عبادت نہ ہو سکے گی۔"

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے توحید کی جو صدا لگائی تھی، اس سے دنیا کا کوئی مذہب، کوئی فلسفہ اور کوئی د اغ غیر متاثر نہیں رہا، جب سے دنیا نے سنا کہ انسان کے لئے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا ذلت اور عار ہے، خدا نے فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے اس لئے جھکایا تاکہ سب سجدے اس کی اولاد پر حرام ہو جائیں، وہ سمجھ لے کہ جب اس کارخانۂ قدرت کے کارندے ہمارے سامنے جھکا دیے گئے تو ہم کو اس دنیا کی کسی چیز کے سامنے جھکنا کب زیب دیتا ہے، جب سے دنیا نے توحید کی یہ حقیقت اور انسان نے اپنی یہ حیثیت سنی، اس وقت سے شرک خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا اس کو احساس کمتری نے گھیر لیا، آپ کو بعثت محمدی کے بعد اس کے لہجہ میں فرق محسوس ہوگا، اب وہ اپنے عمل پر نازاں نہیں، وہ اس کی تاویل اور فلسفیانہ تعبیر کرتا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ توحید کی آواز نے دل میں گھر کر لیا ہے۔

پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس علم و یقین کے ساتھ وہ طاقت بھی پیدا کر کے دکھا دی جس میں ہزار پولیس، سیکڑوں عدالتوں اور بیسیوں حکومتوں سے زیادہ طاقت ہے یعنی

ضمیر کی طاقت، نیکی کی رغبت، گناہ سے نفرت اور نفس کا خود احتساب۔

یہ اسی طاقت کا کرشمہ تھا کہ ایک صحابی جن سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے، وہ بے تاب ہو جاتے ہیں، ضمیر چٹکیاں لینے لگتا ہے اور وہ حضورؐ کی خدمت میں آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں، حضورؐ! مجھ کو پاک کر دیجیے، آپ رخِ انور پھیر لیتے ہیں، وہ اسی طرف آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، آپ دوسری طرف رخ کر لیتے ہیں، وہ اس طرف آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، آپ تحقیق کرواتے ہیں کہ ان کی دماغی حالت خراب تو نہیں، جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح الدماغ آدمی ہیں، تو آپ ان کو سزا دلواتے ہیں، کس چیز نے ان کو سزا پر آمادہ کیا اور کون سی چیز ان کو خود کھینچ کر لائی؟!

آگے چلیے غامدیہ ایک ان پڑھ عورت تھیں کسی دیہات کی رہنے والی، وہ ایک بار بڑے گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں، نہ کوئی دیکھنے والا تھا نہ سننے والا مگر ان کے دل میں ایک پھانس تھی، جو ان کو چین نہ لینے دیتی تھی، ان کو کھانے پینے میں مزا نہ آتا تھا، وہ کھانا کھاتیں تو ان کا دل کہتا کہ تم ناپاک ہو، پانی پیتیں تو دل کہتا کہ تم ناپاک ہو، ناپاک کا کیا کھانا کیا پینا؟ تمہیں پہلے پاک ہونا چاہیے، اس گناہ کی پاکی سزا کے بغیر ممکن نہیں، وہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں، اور تقاضا کرتی ہیں کہ ان کو پاک کر دیا جائے اور اس پر اصرار کرتی ہیں، یہ معلوم کر کے کہ ان کے پیٹ میں بچہ ہے آپ فرماتے ہیں کہ اس بچہ کا کیا قصور، اس کی جان تمہارے ساتھ کیوں جائے، جب یہ ہو جائے تب آنا، خیال کیجیے، ان کو ضرور اس میں کچھ عرصہ لگا ہوگا، کیا انھوں نے کھایا پیا نہ ہوگا، کیا زندگی نے خود ان سے تقاضا نہ کیا ہوگا، کیا خود کھانے پینے کی لذت نے زندگی کی رغبت نہ پیدا کی ہوگی اور ان کو یہ نہ سمجھایا ہوگا کہ اب وہ حضورؐ کے پاس جانے کا ارادہ فسخ کر دیں، مگر وہ اللہ کی بندی پکی رہی اور کچھ عرصہ کے بعد بچہ کو لے کر آئی اور عرض کیا کہ حضورؐ میں اس سے فارغ ہو گئی اب میری طہارت میں کیوں دیر ہو؟ فرمایا نہیں نہیں! ابھی اس کو دودھ پلاؤ جب دودھ چھوٹے تب آنا، آپ کو

معلوم ہے کہ اس کو دو برس تو ضرور لگے ہوں گے، یہ دو برس کیسی آزمائش کے تھے، نہ پولیس تھی، نہ نگرانی نہ مچلکہ، نہ ضمانت، کتنے خیال اس کو آئے ہوں گے، بچہ کی معصوم صورت اس کو جینے کی دعوت دیتی ہوگی، اس کی مسکراہٹ زندگی کی خواہش پیدا کرتی ہوگی، اور بچہ اپنی زبانِ بے زبانی سے کہتا ہوگا کہ اماں میں تو تیری ہی گود میں پلوں گا اور تیری انگلی پکڑ کر چلوں گا، مگر اس کا ضمیر کہتا تھا نہیں تیری ماں ناپاک ہے اس کو سب سے پہلے پاک ہونا ہے، دل کا یقین کہتا تھا کہ احکم الحاکمین کے یہاں جانا ہے، وہاں کی سزا سخت ہے، وہ پھر حاضر ہوئی، روٹی کا ٹکڑا بچہ کے منھ میں ہے، اور کہتی ہے، یا رسول اللہ! دیکھیے اس بچہ کا دودھ بھی چھوٹ گیا اور وہ روٹی کھانے کے قابل ہوگیا ہے، اب میری پاکی میں کیا دیر ہے؟ آخر خدا کی اس سچی اور پکی بندی کو سزا دی جاتی ہے، اور حضورؐ خوشنودی کا پروانہ عطا کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ اس نے ایسی سچی توبہ کی ہے کہ اس اکیلی کی توبہ اگر سارے مدینہ پر تقسیم کردی جائے تو سب کے لئے کافی ہو، رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا۔

میں پوچھتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی، جو بغیر ہتھکڑی بیڑی کے بغیر مچلکہ و ضمانت کے، بغیر پولیس کے اس کو کھینچ کر لاتی ہے اور سزا کے لئے اصرار کرواتی ہے، آج ہزاروں پڑھے لکھے، قابل فاضل مرد اور عورتیں ہیں، جن کا علم اور نقصانات کا یقین ان کو غلط کام سے باز نہیں رکھ سکتا اور اچھے کام پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو یہی تینوں انمول موتی عطا کئے، علم صحیح، یقین کامل اور نیکی کا تقاضائے قلبی، دنیا کو نہ اس سے زیادہ قیمتی سرمایہ ملا، نہ کسی نے اس پر آپ سے بڑھ کر احسان کیا۔

دنیا کے ہر انسان کو فخر کرنا چاہئے کہ ہماری نوع انسان میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس سے انسانیت کا سر اونچا اور نام روشن ہوا، اگر آپ نہ آتے تو دنیا کا نقشہ کیا ہوتا اور ہم انسانیت کی شرافت و عظمت کے لئے کس کو پیش کرتے؟ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر انسان کے ہیں،

محمد رسول اللہ سے اس دنیا کی رونق اور نوعِ انسانی کی عظمت ہے، وہ کسی قوم کی ملک نہیں، ان پر کسی ملک کا اجارہ نہیں، وہ پوری انسانیت کا سرمایۂ فخر ہیں، کیوں آج کسی ملک کا انسان فخر و مسرت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ میرا اس نوع سے تعلق ہے، جس میں محمد رسول اللہ جیسا انسان کامل پیدا ہوا۔

آج انسانوں کا کون سا طبقہ ہے، جس پر آپ کا براہِ راست یا بالواسطہ احسان نہیں؟ کیا مردوں پر آپ کا احسان نہیں؟ کہ آپ نے ان کو مردانگی اور آدمیت کی تعلیم دی، کیا عورتوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق بتلائے اور ان کے لئے ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں، آپ نے فرمایا کہ "جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے" کیا کمزوروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کی حمایت کی اور فرمایا کہ "مظلوم کی بددعا سے ڈرو کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں، خدا کہتا ہے کہ میں شکستہ دلوں کے پاس ہوں" کیا طاقت وروں اور حکمرانوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق و فرائض بھی بتلائے، اور حدود بھی بتلائے اور انصاف کرنے والوں اور خدا سے ڈرنے والوں کو بشارت سنائی کہ بادشاہ منصف رحمت کے سایہ میں ہوگا، کیا تاجروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے تجارت کی فضیلت اور اس پیشہ کی شرافت بتلائی اور خود تجارت کر کے اس گروہ کی عزت بڑھائی، کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں، اور راست گفتار اور دیانتدار تاجر جنت میں قریب قریب ہوں گے، کیا آپ کا مزدوروں پر احسان نہیں کہ آپ نے تاکید فرمائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو، کیا جانوروں تک پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہر وہ مخلوق جو جگر رکھتی ہے، اور جس میں احساس و زندگی ہے، اس کو آرام پہونچانا اور کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے، "فی کل ذات کبد حرّیٰ صدقۃ" کیا ساری انسانی برادری پر آپ کا احسان نہیں کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ شہادت دیتے تھے کہ خدایا تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں "انا شهيد ان العباد كلهم اخوة" کیا ساری دنیا پر آپ کا احسان نہیں کہ سب سے پہلے دنیا

نے آپ ہی کی زبان سے سنا کہ خدا کسی ملک، قوم، نسل و برادری کا نہیں سارے جہانوں اور دنیا کے سب انسانوں کا ہے جس دنیا میں آریوں کا خدا، یہودیوں کا خدا، مصریوں کا خدا، ایرانیوں کا خدا کہا جاتا تھا، وہاں "الحمد للہ رب العالمین" کی حقیقت کا اعلان ہوا اور اس کو نماز کا جز بنا دیا گیا۔

ہماری آپ کی دنیا میں حکماء و فلاسفر بھی آئے، ادبا و شعراء بھی، فاتح و کشور کشا بھی، سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی، موجدین و مکتشفین (سائنٹسٹ) بھی، مگر کس کے آنے سے دنیا میں وہ بہار آئی جو پیغمبروں کے آنے سے، پھر سب سے آخر سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے سے آئی، کون اپنے ساتھ وہ شادابی، وہ برکتیں، وہ رحمتیں نوعِ انسانی کے لئے، وہ دولتیں اور انسانیت کے لئے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پورے وثوق کے ساتھ آپ کو خطاب کر کے کہتی ہے ؎

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

اُمّت کے وفود آقا کے حضور میں! [1]

مورخین اور مصنفین کو خدا معاف کرے، مقدس سے مقدس مقامات اور افضل سے افضل اوقات میں بھی یہ تاریخی ذوق اور طرزِ فکر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور وہ چند لمحات کے لئے بھی اس سے آزاد نہیں ہو پاتے، وہ جہاں بھی ہوتے ہیں، اپنے علم و مطالعہ کی فضا میں سانس لیتے ہیں، اور حال کا رشتہ ہمیشہ ماضی سے جوڑنا چاہتے ہیں، مناظر کو دیکھ کر ان کا ذہن بہت جلد اس تاریخی منظر کی تلاش میں نکل جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں ان مناظر کا وجود اور نمود ہے۔

میں کل مسجد نبوی میں روضۂ جنت میں بیٹھا ہوا تھا [2]، میرے چاروں طرف نمازیوں اور عبادت گزاروں کا کثیر مجمع تھا، ان میں کچھ لوگ سجدے میں تھے، اور کچھ رکوع میں، تلاوت قرآن کی آوازیں

---

[1] یہ اس عربی تقریر کا ترجمہ ہے جو ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ میں سعودی ریڈیو اسٹیشن جدہ سے نشر کی گئی تھی، ترجمہ مولوی محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے قلم سے ہے جو الفرقان بابت محرم الحرام ۱۳۸۲ھ مطابق جولائی ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا، یہ ترجمہ بھی سعودی ریڈیو اسٹیشن سے بعد میں نشر ہوا، اور فیچر کے طور پر پیش کیا گیا، لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر یہ فیچر پیش کیا گیا اور اس کے پیش کرنے پر شفاعت علی صدیقی صاحب کو انعام ملا۔

[2] اس سے وہ مقام مراد ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے، بخاری کی حدیث ہے: عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما بین بیتی ومنبری روضۃ من ریاض الجنۃ ومنبری علی حوضی۔ (بخاری شریف ج ۱، ص ۲۵۳ باب فضائل المدینہ)

فضا میں اس طرح گونج رہی تھیں، جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتے میں بھنبھنا رہی ہوں، اس وقت کا سماں کچھ ایسا تھا کہ مجھے تاریخ اور تاریخی شخصیات کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کر دینا چاہئے تھا، لیکن تاریخ کی قدیم یادیں بادلوں کی طرح میرے دل و دماغ پر چھا گئیں اور میرا ان پر کوئی زور نہ چل سکا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس امت کی بعض نامور شخصیتوں اور رہنماؤں کو ایک نئی زندگی عطا کی گئی ہے اور وہ وفود کی شکل میں یکے بعد دیگرے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو رہے ہیں، اور اسی عظیم مسجد میں فریضۂ نماز ادا کرنے کے بعد اسی عظیم نبیؐ کو ہدیۂ سلام اور خراجِ عقیدت و محبت پیش کر رہے ہیں، اور اس کے احسان کا اعتراف کر رہے ہیں، اور باوجود اس کے کہ وہ مختلف زمانوں، مقامات اور طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، سب یک زبان ہو کر اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ آپؐ ہی وہ نبیؐ ہیں، جنھوں نے اللہ کے حکم سے ان کو ظلمت سے روشنی کی طرف، تیرہ بختی سے خوش بختی کی طرف مخلوق کی عبادت سے خدائے واحد کی عبادت کی طرف اور مذاہب کے ظلم واستبداد سے اسلام کے عدل وانصاف کی طرف اور دنیا کی تنگی سے اس کی کشادگی کی طرف منتقل کیا، وہ اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ اسلام ہی کی پیداوار ہیں، اور ان کا سارا وجود اور زندگی نبوت کی مرہون منت ہے، اگر خدانخواستہ ان سے وہ سب واپس لے لیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نبیؐ کے ذریعہ عطا کیا تھا اور نبوت کے وہ عطیے ان سے چھین لئے جائیں جنھوں نے دنیا میں ان کو عزت و سرفرازی بخشی تھی، تو ان کی حیثیت ایک بے روح اور بے جان ڈھانچے اور چند مبہم اور بے مقصد خطوط واشکال سے زیادہ نہ رہ جائے گی اور وہ تاریخ کے اس تاریک ترین عہد کی طرف واپس چلے جائیں گے جہاں جنگل کے قانون اور ظلم واستبداد کا دور دورہ تھا، اور موجودہ تہذیب وتمدن کا ــــــــ نام ونشان تک مٹ جائے گا۔

اچانک میری نگاہ ایک طرف اٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ باب جبرئیلؑ سے (جو مجھ سے زیادہ قریب تھا) ایک جماعت داخل ہورہی ہے، سکون ووقار میں ڈوبے ہوئے لوگ ان کی پیشانی سے علم کا نور اور ذہانت کا وفور صاف عیاں تھا، وہ باب الرحمۃ اور باب جبرئیل کے درمیانی حصہ میں پھیل گئے، وہ اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ ان کے شمار کا کوئی سوال نہیں تھا، میں نے دربان سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ اس نے کہا کہ:۔ اس اُمت کے امام اور رہنما انسانیت کے محسن اور نوعِ انسانی کے ممتاز اور قابلِ فخر نمونے ہیں، ان میں سے ہر ایک پوری پوری قوم کا امام، پورے کتب خانہ اور مکتبِ فکر کا بانی اور مؤسس، پوری نسل کا مربی اور مستقل علوم وفنون کا موجد ہے، ان کے لازوال آثار اور لافانی شاہکار اور نمونے آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں، ان کے علم واجتہاد اور تحقیق کی روشنی میں کئی کئی نسلوں نے سفر زندگی طے کیا ہے، اس نے عجلت کے ساتھ چند ہستیوں کے نام بھی مجھے بتادیئے، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، لیث بن سعد مصری، امام اوزاعی، امام بخاری، امام مسلم، تقی الدین بن تیمیہ، ابن قدامہ، ابواسحاق الشاطبی، کمال ابن ہمام، شاہ ولی اللہ دہلوی، اگرچہ ان شخصیتوں میں اپنے زمانہ اور اپنے ملک ووطن اور اپنی علمی و دینی حیثیتوں اور مراتب کا بڑا فرق تھا، لیکن ان سب نے اس موقع پر بارگاہِ نبویؐ میں خراجِ عقیدت پیش کیا اور اشکِ ندامت نذر کئے۔

میں نے دیکھا کہ سب سے پہلے انھوں نے تحیۃ المسجد کا دوگانہ بہت خشوع وخضوع اور حضوریِ قلب کے ساتھ ادا کیا، پھر بہت ادب اور تواضع کے ساتھ مرقدِ مبارک کی طرف بڑھے اور بہت جچے تلے، مختصر، معانی سے لبریز، گہرے اور پُر مغز کلمات کے ساتھ سلام پیش کیا، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی آواز اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے ان کی

لہ باب جبرئیل مسجد نبوی کے اہم اور قدیم دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جو مرقد نبوی سے سب سے زیادہ قریب ہے۔

آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز میں رقت، وہ کہہ رہے تھے۔

"یا رسول اللہ! اگر آپ کی لازوال، وسیع اور جامع، عادلانہ اور کشادہ شریعت نہ ہوتی اور اس کے وہ اُصول نہ ہوتے جن سے انسانی ذہن اور انسانی صلاحیت نے نئے نئے گل بوٹے پیدا کئے اور دنیا کا دامن بیش قیمت اور عطر بیز پھولوں سے بھر دیا اور اس کا وہ حکیمانہ اور معجزانہ نظام نہ ہوتا جس نے انسانی فکر و تدبر اور اخذ و استنباط کی صلاحیت کو پیدا کر دیا اور اگر وہ انسانیت کی ایک اہم ضرورت نہ ہوتی تو نہ اس عظیم فقہ کا کوئی وجود ہوتا نہ یہ عظیم اسلامی قانون وجود میں آتا جس سے اس وقت تک ہر قوم کا دامن خالی ہے، نہ اتنا بڑا اسلامی کتب خانہ پیدا ہوتا جس کے سامنے دنیا کا سارا مذہبی لٹریچر ہیچ ہے، اگر علم کی اشاعت اور خدا کی نشانیوں اور اس کی قدرت کاملہ میں غور و فکر اور عقل سے کام لینے کی آپ نے ایسی پرزور دعوت نہ دی ہوتی تو یہ شجرِ علم زیادہ دنوں تک برگ و بار نہ لا سکتا اور نہ اس کا سایہ تمام دنیا پر ایسا محیط ہوتا جیسا کہ آج نظر آرہا ہے، عقل انسانی پہلے کی طرح پابہ زنجیر ہوتی اور دنیا روشنی سے محروم"۔

میں اس جماعت کو جی بھر کر دیکھ نہ سکا تھا کہ میری نظر ایک دوسرے گروہ پر پڑی جو باب الرحمۃ سے ہو کر اندر کی طرف بڑھ رہا تھا، صلاح و تقویٰ اور زہد و عبادت کے آثار ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھے، مجھے بتایا گیا کہ اس جماعت میں حسن بصری، عمر بن عبد العزیز، سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، داؤد الطائی، ابن السماک، شیخ عبد القادر جیلانی، نظام الدین اولیا، اور عبد الوہاب المتقی جیسے حضرات بھی رونق بخش ہیں، جنھوں نے اپنے قابل رشک پیشروؤں کی یاد تازہ کر دی، نماز کے بعد یہ لوگ بھی قبر مبارک کے سامنے کھڑے ہوئے اور اپنے نبیؐ و پیشوا اور سب سے بڑے معلم اور رہنما کو درود و سلام کا تحفہ پیش کرنے لگے، وہ کہہ رہے تھے۔

"یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے وہ عملی مثال نہ ہوتی جو آپ نے پیش فرمائی تھی، اور وہ

مینارۂ نور نہ ہوتا جس کو آپ نے بعد کے آنے والوں کے لئے قائم فرمایا تھا، اگر آپ کا یہ قول نہ ہوتا کہ "اے اللہ! زندگی تو آخرت کی زندگی ہے" اگر آپ کی یہ وصیت نہ ہوتی کہ "دنیا میں اس طرح زندگی گزارو جس طرح کوئی مسافر یا راہی زندگی گزارتا ہے" اگر زندگی کا وہ طرز نہ ہوتا جس کا ذکر حضرت عائشہؓ نے اس طرح کیا ہے کہ: "ایک چاند کے بعد دوسرا چاند اور دوسرے کے بعد تیسرا چاند نکل آتا تھا اور آپ کے گھر میں آگ نہ جلتی تھی، نہ چولہے پر دیگچی چڑھانے کی نوبت آتی تھی" تو ہم دنیا پر اس طرح آخرت کو ترجیح نہ دے سکتے، اور نہ ہم محض گذارہ پر بسر کر سکتے اور نہ قناعت کو اپنی زندگی کا شعار بنا سکتے، نہ ہم نفس کی ترغیبات پر قابو پا سکتے، اور نہ دنیا کے حسن و جمال اور اس کی رعنائی و زیبائی اور عہدہ و منصب کی طاقت اور کشش کا اس طرح مقابلہ کر سکتے"

ان کے حکیمانہ الفاظ ابھی پوری طرح میرے دل و دماغ میں پیوست بھی نہ ہوئے تھے کہ میری نظر ایک اور گروہ پر پڑی جو "باب النساء"[۱] سے بہت لحاظ اور ادب کے ساتھ گزر رہا تھا، ظاہری آرائش اور آزادروی کے ان مناظر سے جو اسلامی اصول و آداب کے منافی ہیں، یہ گروہ بالکل محفوظ اور خالی تھا، یہ مختلف قوموں اور دور دراز ملکوں کی صالح، عبادت گزار اور عفیف خواتین تھیں جو عرب و عجم اور مشرق و مغرب کے مختلف خطوں سے تعلق رکھتی تھیں، بہت دبی زبان میں اور پورا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنے جذباتِ تشکر و عقیدت کا اظہار اس طرح کر رہی تھیں۔

"ہم آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں، یا رسول اللہ! ایسے طبقہ کا درود و سلام جس پر آپ کا بہت بڑا احسان ہے، آپ نے ہم کو خدا کی مدد سے جاہلیت کی بیڑیوں، اور بندشوں، جاہلی عادات و روایات سوسائٹی کے ظلم اور مردوں کی زوردستی اور زیادتی سے نجات بخشی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے

---

[۱] مسجد نبویؐ کا قدیم دروازہ جو دورِ اول میں عورتوں کے ساتھ مخصوص تھا۔

رواج کو ختم کیا، ماؤں کی نافرمانی پر وعید سنائی، آپ نے فرمایا کہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے، آپ نے وراثت میں ہم کو شریک کیا اور اس میں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے ہم کو حصہ دلایا، حجۃ الوداع کے مشہور تاریخی خطبہ میں بھی آپ نے ہمیں فراموش نہیں کیا، اور کہا کہ "عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو اس لئے کہ تم نے ان کو اللہ کے نام کے واسطہ سے حاصل کیا ہے" اس کے علاوہ مختلف مواقع پر آپ نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، ادائے حقوق اور بہتر معاشرت کی ترغیب دی، اللہ تعالٰی آپ کو ہمارے طبقہ کی طرف سے وہ بہتر سے بہتر جزا دے جو انبیاء و مرسلین اور اللہ کے نیک اور صالح بندوں کو دی جا سکتی ہے"۔

یہ نرم آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں کہ ایک اور جماعت نظر آئی جو "باب السلام" کی طرف سے آرہی تھی، میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ وہ علوم و فنون کے موجد اور مرتب ائمہ نحو و لغت و بلاغت کی جماعت تھی، اس میں ابوالاسود الدئلی، خلیل بن احمد، سیبویہ، کسائی، ابو علی الفارسی، عبد القاہر الجرجانی، السکاکی، مجدالدین فیروز آبادی، سید مرتضیٰ بلگرامی..... بھی تھے، جو اپنے علوم کا سلام پیش کر رہے تھے، اور اپنی شہرت اور مرتبۂ علمی کا خراج ادا کرنے آئے تھے، میں نے دیکھا وہ بہت بلیغ اور ادبی الفاظ میں اس طرح گویا ہیں۔

"یا رسول اللہ! اگر آپ نہ ہوتے اور یہ مقدس کتاب نہ ہوتی جو آپ پر نازل ہوئی، اگر آپ کی احادیث نہ ہوتیں اور یہ شریعت نہ ہوتی جس کے سامنے ساری دنیا نے سر تسلیم خم کر دیا تھا اور وہ اس کی وجہ سے عربی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے پر مجبور تھی، تو پھر یہ علوم بھی نہ ہوتے جن میں آج ہم کو امامت و قیادت کا شرف حاصل ہے، نحو، بیان اور بلاغت ان میں سے کسی چیز کا بھی وجود نہ ہوتا، نہ یہ بڑی بڑی معاجم اور لغات نظر آتیں، نہ عربی زبان کے مفردات میں یہ نکتہ آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں ہوتیں، نہ ہم اس راستہ میں اتنی زبردست اور طویل جدوجہد کے

لئے تیار ہوتے (جس کے یہاں زبانوں اور بولیوں کی کوئی کمی نہ تھی) عربی سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہ ہوتی اور نہ ان میں وہ مصنفین اور اہلِ قلم پیدا ہوتے جن کی ادبیت و زبان دانی کا اہلِ زبان نے بھی لوہا مان لیا، یا رسولؐ اللہ! آپ ہی ہمارے درمیان اور اسلام میں پیدا ہونے والے ان علوم کے درمیان واسطہ اور رابطہ تھے جو آپ کی بعثت کے بعد وجود میں آئے، درحقیقت صرف آپ ہی عرب و عجم میں رابطہ کا ذریعہ ہیں، آپ ہی کی ذات ہے جس نے اس درمیانی خلا کو پُر کیا اور عرب و عجم اور مشرق و مغرب کو گلے ملا دیا اور شیر و شکر بنا دیا۔ آپ کا کتنا احسان ہے، ہماری اس ذہانت، طباعی اور تبحر علمی پر، اور آپ کا کتنا کرم ہے علم کی اس دولت پر، انسانی عقل کی زرخیزی پر، اور قلم کی گلکاری پر، یا رسولؐ اللہ! اگر آپ نہ ہوتے تو یہ عربی زبان بہت سی اور زبانوں کی طرح صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جاتی، اگر قرآن مجید کا غیر فانی صحیفہ اس کا پاسبان نہ ہوتا تو اس میں اتنا تغیر و تبدل ہو جاتا کہ اس کی صورت ہی مسخ ہو جاتی اور وہ ایک نئی زبان بن جاتی جیسا کہ بکثرت دوسری زبانوں کے ساتھ ہوا ہے، عجمی الفاظ اور مقامی زبانیں اس کو جذب کر لیتیں یا نگل لیتیں اور اس کی صحت و اصلیت یکسر ختم ہو جاتی، یہ آپ کے وجود مبارک، شریعت اسلامی، اور اس کتاب مقدس کا فیض ہے جس نے اس زبان کو فنا کی دستبرد سے محفوظ رکھا ہے، اور عالم اسلام کے لئے اس کی عزت و محبت واجب کر دی ہے، اور ہر مسلمان کے دل کو اس کا اسیر محبت بنا دیا ہے، آپ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو دوام بخشا اور اس کے بقا و ترقی کی ضمانت کی، اس لئے ہر اس شخص پر جو اس زبان میں بات کرتا ہے یا لکھتا ہے یا اس کی وجہ سے کوئی بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے یا اس کی دعوت دیتا ہے، آپ کا احسان ہے اور وہ اس احسان کا کبھی منکر یا اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

میں ان کے اس تشکر و اعتراف اور اظہار حقیقت کو غور سے سن رہا تھا کہ اچانک میری

میری نگاہ "باب عبدالعزیز"[1] پر جاکر ٹھہر گئی، اس دروازے سے ایک ایسا گروہ داخل ہو رہا تھا، جس پر مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے رنگ نمایاں تھے، اس میں دنیا کے بڑے بڑے سلاطین اور تاریخ کے ممتاز ترین بادشاہ اور فرمانروا شامل تھے، ہارون رشید، ولید بن عبدالملک، ملک شاہ سلجوقی صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، ظاہر بیبرس، سلیمان اعظم، اورنگ زیب عالمگیر بھی اس گروہ میں شامل تھے، انھوں نے اردلیوں اور چوبداروں کو دروازہ کے باہر ہی چھوڑ دیا تھا، اور نظریں جھکائے ہوئے، تواضع وانکسار کا مجسمہ بنے ہوئے بہت آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہوئے چل رہے تھے، میری نظر کے سامنے ان سب کی شخصیتیں اور کارنامے ابھرنے لگے، میری آنکھوں میں اس طویل وعریض دنیا کا نقشہ پھر گیا جس پر ان کا سکہ چلتا، ان کا ڈنکا بجتا تھا، ان کی بادشاہی اور فرمانروائی کی تصویر یکایک میرے سامنے آگئی، جو ان کو دنیا کی بڑی بڑی قوموں، طاقتور سلطنتوں اور جابر بادشاہوں پر حاصل تھی (ان میں وہ ہستی بھی تھی[2] جس نے بادل کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ کہا تھا "تو جہاں چاہے جاکے برس، تیرا خراج آخر کار میرے ہی خزانہ میں آئے گا" وہ شخص بھی تھا[3] جس کی سلطنت کی وسعت کا عالم یہ تھا کہ اگر سب سے تیز رفتار سانڈنی سوار سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا چاہتا تو یہ ۱۵ ماہ سے کم میں ناممکن تھا، ان میں وہ فرمانروا بھی تھے جو نصف کرۂ ارضی پر حکومت کرتے تھے، اور بڑے بڑے بادشاہ ان کو خراج پیش کرنے پر مجبور رکھتے[4]۔ ایسے فرمانروا بھی تھے، جن کی

---

[1] مسجد نبوی کا وہ نیا دروازہ جو جدید تعمیر کے بعد باب مجیدی کے پہلو میں بنا دیا گیا ہے اور سلطان عبدالعزیز بن سعود کے نام سے موسوم ہے۔ [2] ہارون رشید کی طرف اشارہ ہے [3] ولید بن عبدالملک مراد ہیں۔ [4] ملک شاہ سلجوقی کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ترکستان کے مشہور دریا جیحون کے ملاحوں کو جن کی کشتیاں کرایہ پر کی گئی تھیں، کرایہ ادا کرنے کے لئے حاکم انطاکیہ (ملک شام) کے نام فرمان جاری کیا گیا کہ وہ ملاحوں کو یہ رقم خزانہ سے ادا کرے نیز ۴۸۲ھ میں روم کا سفیر سالانہ خراج لے کر اصفہان حاضر ہوا، ملک شاہ نے کاشغر پہونچکر اس سے خراج لیا اور سفیر کو یہاں سے رخصت کیا (نظام الملک طوسی ص ۶۲۲)

ہیبت سے سارا یورپ لرزہ براندام تھا، اور جن کے زمانہ میں مسلمانوں کو عزت کا یہ مقام حاصل تھا کہ جب وہ یورپ کے ملکوں میں جاتے تھے تو ان کے دین کے احترام اور ان کے غلبہ و سطوت کے اثر سے گرجوں کے گھنٹے بجنا بند ہو جاتے تھے۔[1] غرض اسی طرح کے نہ جانے کتنے بادشاہ اور فرمانروا اس مجمع میں موجود تھے، وہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کے لئے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور حضورؐ کو درود و سلام کا ہدیہ پیش کرنا چاہتے تھے، اور اس کو اپنے لئے سب سے بڑا شرف و اعزاز اور سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے، اور تمنا کرتے تھے کہ کاش ان کی یہ نماز اور یہ درود و سلام قبول ہو، میں نے دیکھا کہ وہ لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں، ان کے دلوں پر ہیبت طاری تھی، یہاں تک کہ وہ "صفہ" کے نزدیک پہونچ گئے جو فقرا، صحابہ کا مسکن اور جائے قیام تھا، وہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں رک گئے اور عزت و احترام اور شرم و حیا کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس جگہ کو دیکھنے لگے جو کبھی ان فقراء و مساکین کا ٹھکانا تھا جن کے قدموں کی خاک کو یہ اپنی آنکھ کا سرمہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے قریب ہی انھوں نے تحیۃ المسجد کے طور پر دو رکعتیں پڑھیں اور قبر مبارک کی طرف بڑھے اور پھر ان کی محبت و عقیدت، جذبات و احساسات اور علم و ایمان نے جو کچھ کہلوایا وہ انھوں نے اس بارگاہ نبوی میں عرض کیا لیکن شریعت کے آداب کا خیال رکھتے ہوئے اور توحید خالص کو پیش نظر رکھ کر۔

میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے۔

"اے خدا کے رسولؐ! اگر آپ نہ ہوتے اور آپ کا یہ جہاد اور یہ دعوت نہ ہوتی جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی اور جس نے بڑے بڑے ملکوں کو فتح کر لیا، اور اگر آپ کا یہ دین نہ ہوتا، جس پر ایمان لانے کے بعد ہمارے آباد و اجداد گوشۂ عزلت اور قعر مذلت سے نکل کر عزت و

---

[1] سلیمان اعظم شہنشاہ ترکی کی طرف اشارہ ہے۔

سربلندی، بلند ہمتی و حوصلہ مندی کی وسیع زندگی میں داخل ہوئے، پھر اس کے نتیجہ میں انھوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں، دور دراز ملکوں کو فتح کیا اور ان قوموں سے خراج وصول کیا جو کسی زمانہ میں ان کو اپنی لاٹھی سے ہانکتی تھیں اور بھیڑ بکری کے گلہ کی طرح ان کی پاسبانی اور حفاظت کرتی تھیں، اگر جاہلیت سے اسلام کی طرف اور گوشۂ گمنامی اور تنگ و محدود قبائلی زندگی سے تسخیر عالم کی طرف یہ مبارک سفر نہ ہوتا جو آپ کی برکت سے انجام پذیر ہوا تو دنیا میں کسی جگہ بھی ہمارا جھنڈا سربلند نہ ہوتا اور نہ ہماری کہانی کسی جگہ سنائی جاتی، ہم اسی طرح بے آب و گیاہ، خشک و ویران صحراؤں اور حقیر وادیوں میں دست و گریبان رہتے جو طاقت ور ہوتا وہ کمزور پر ظلم کرتا، بڑا چھوٹے پر زیادتی کرتا، ہماری غذا بہت ہی حقیر اور معیار زندگی اتنا پست تھا کہ اس سے زیادہ پست کا تصور مشکل ہے، ہم اس گاؤں یا اپنے محدود قبیلہ سے آگے بڑھ کر کچھ سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے، جس میں ہماری ساری زندگی اور ساری جد و جہد محصور تھی، ہماری مثال تالاب کی مچھلیوں اور کنویں کے مینڈکوں کی سی تھی، ہم اپنے محدود تجربوں کے جال میں گرفتار تھے اور اپنے جاہل اور بے عقل آباؤ اجداد کے گن گاتے تھے۔

یا رسول اللہ! آپ نے ہم کو اپنے دین کی ایسی روشنی عطا کی کہ ہماری آنکھیں کھل گئیں، خیال میں وسعت پیدا ہوئی، نظر کو جلا ہوئی، اس کے بعد ہم اس وسیع اور جامع دین اور اس روحانی رشتہ اور رابطہ کو لے کر خدا کی وسیع اور کشادہ زمین میں پھیل گئے، ہماری مردہ و خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور ہم نے ان صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے شرک و بت پرستی اور ظلم و جہالت کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور ایسی عظیم الشان حکومتیں قائم کیں جن کے سایہ میں ہم اور ہماری اولاد اور ہمارے بھائی صدیوں تک آرام اور فائدہ اٹھاتے رہے، آج ہم آپ کی خدمت میں غلامانہ نذر عقیدت پیش کرنے آئے ہیں اور اپنے جذبۂ محبت

اور عزت واحترام کا خراج یا ٹیکس اپنی خوشی و مرضی سے ادا کر رہے ہیں اور اس کو اپنے لئے باعث فخر اور وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں، ہمیں پورا اعتراف ہے کہ اس دین کے احکام و قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں (جس سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو سرفراز کیا تھا) ہم سے یقیناً بڑی کوتاہی ہوئی، ہم اللہ سے استغفار کرتے ہیں، بے شک وہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

میں ان بادشاہوں کی طرف متوجہ تھا میری نظریں ان کے خاموش اور باادب چہروں پر مرکوز تھیں، میرے کان ان کے ان پُرخلوص نیازمندانہ الفاظ پر لگے ہوئے تھے جو اس سے قبل میں نے ان سے کسی موقع پر نہیں سنے تھے کہ ایک اور جماعت داخل ہوئی اور ان بادشاہوں اور فرماں رواؤں کی پرواہ کئے بغیر ان کی صفوں سے ہوتی ہوئی سامنے آگئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان بادشاہوں کے رعب و دبدبہ اور قوت و اقتدار کا ان پر کوئی اثر نہیں ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ یا تو یہ شاعر ہیں یا انقلابی، یہ اندازہ غلط نہ تھا اس لئے کہ یہ جماعت ان دونوں گروہوں پر مشتمل تھی، اس میں سید جمال الدین افغانی، امیر سعید حلیم، مولانا محمد علی جوہر، شیخ حسن البنا کے پہلو بہ پہلو ترکی کے مشہور شاعر محمد عاکف اور ہندوستان کے ڈاکٹر محمد اقبال بھی موجود تھے، ترجمانی کے لئے ان لوگوں نے آخر الذکر کا انتخاب کیا اور لائق ترجمان نے ان الفاظ میں اپنے جذبات عقیدت کا اظہار کیا:۔

"خواجۂ کونین سالار بدر و حنین، یا رسول اللہ! میں آپ سے اس قوم کی شکایت کرتے آیا ہوں جو آج بھی آپ کے خوانِ نعمت کی ریزہ چیں ہے اور آپ کے سایۂ رحمت کے سوا اس کو کہیں پناہ نہیں ملتی، اور آپ ہی کے لگائے ہوئے باغ کے پھل کھا رہی ہے، وہ ان ملکوں میں جن کو آپ نے قفس استبداد سے آزاد کرایا تھا، اور

سورج کی روشنی اور کھلی ہوا عطا کی تھی، وہ آج آزادی کے ساتھ اور اپنے مرضی کے مطابق حکومت کر رہی ہے، لیکن یہی قوم آج اسی بنیاد کو اکھاڑ رہی ہے جس پر اس عظیم امت کے وجود کا دارومدار ہے، اس کے رہنما و لیڈر آج یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس امت واحدہ کو کثیر التعداد قومیتوں میں تقسیم کر دیں، وہ اسی چیز کو زندہ کرنا چاہتے ہیں جس کو آپ نے ختم کیا تھا، اسی چیز کو بگاڑ رہے ہیں جس کو آپ نے بنایا تھا، وہ اس اُمت کو عہدِ جاہلیت کی طرف دوبارہ واپس لے جانا چاہتے ہیں جس سے آپ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکالا تھا اور اس معاملہ میں یورپ کی تقلید کر رہے ہیں جو خود زبردست ذہنی افلاس اور انتشار و بے یقینی کا شکار ہے، وہ اللہ کی نعمت کو ناشکری سے تبدیل کر کے اپنی قوم کو تباہی کے گھر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، "چراغ مصطفوی" اور "شرار بولہبی" کی معرکہ آرائی آج پھر قائم ہے، بدقسمتی سے ابولہب کے کیمپ کی طرف وہ لوگ نظر آ رہے ہیں، جو اسلام کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں اور عربی زبان بولتے ہیں، وہ آج اپنے جاہلی کارناموں اور اصنام پر فخر کرنے لگے ہیں جن کو آپ نے پاش پاش کر دیا تھا۔ یہ لوگ ان تاجروں میں ہیں جو سودا خریدتے وقت تو زیادہ لینا چاہتے ہیں اور بیچتے وقت کم دیتے ہیں، آپ سے انھوں نے ہر چیز حاصل کی اور ہر طرح کی قوت و عزت سے بہرہ مند ہوئے اب وہ ان قوموں کے ساتھ جن کے وہ حاکم اور نگراں ہیں یہ سلوک کر رہے ہیں کہ ان کو بالجبر یورپ کے قدموں میں ڈال دینا چاہتے ہیں اور اس کو جاہلی فلسفوں، نیشنلزم، سوشلزم، کمیونزم کے حوالہ کر رہے ہیں۔

آپ نے جن بتوں سے کعبہ کو پاک کیا تھا، وہ آج مسلمان قوموں کے سروں پر نئے نئے ناموں اور نئے نئے لباسوں میں پھر مسلط کئے جا رہے ہیں، مجھے عالم عربی کے بعض حصوں میں جن کو آپ کا مرکز اور قلعہ ہونا چاہیئے تھا، ایک عام بغاوت نظر آ رہی ہے لیکن کوئی فاروق (رضی اللہ

عنہ) نہیں، فکری و ذہنی ارتداد کی آگ تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور کوئی ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نہیں جو اس کے لئے مردانہ وار میدان میں آئے اور اس آگ کو بجھائے۔

میری طرف سے اور میرے تمام ساتھیوں کی طرف سے جن کی نمائندگی اور ترجمانی کا فخر مجھے حاصل ہوا..... دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے اور عقیدت و احترام کے جذبات میں ڈوبے ہوئے سلام کا تحفہ قبول ہو، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ہم ان تمام لیڈروں اور رہنماؤں سے بری اور بیزار ہیں، جنھوں نے اپنا رُخ اسلام کے قبلہ کی طرف سے پھیر کر مغرب کی طرف کر لیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھیں آپ سے اور آپ کے دین سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے، ہم آپ کی وفاداری اور اطاعت شعاری کا پھر اعلان کرتے ہیں، اور جب تک زندگی ہے اسلام کی اس رسّی کو انشاء اللہ مضبوطی سے پکڑے رہیں گے!"

یہ بلیغ اور ایمان و یقین سے لبریز الفاظ ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ مسجد نبویؐ کے میناروں سے اذان کی دلنواز صدا بلند ہوئی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر میں یکبارگی ہشیار ہو گیا اور تخیلات کا یہ حسین سلسلہ جو تاریخ کے سہارے قائم ہوا تھا، ٹوٹ گیا، اور میں نے کہا ؎

مؤذن مرحبا بروقت بولا   تری آواز مکّے اور مدینے

میں اب پھر اسی دنیا میں واپس آ گیا تھا جہاں سے چلا تھا، کچھ لوگ نماز میں مشغول تھے، اور کچھ تلاوت کر رہے تھے، عالم اسلام کے مختلف وفود اور جماعتیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ہدیۂ سلام پیش کر رہی تھیں، زبانوں اور لہجوں کے اختلافات کے ساتھ جذبات و تاثرات کے اتحاد نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔[1]

---

[1] یہ عربی تقریر جس کا یہ ترجمہ ہے جدہ میں مصنف کے عزیز و محبوب دوست و میزبان حاجی ارشد مرحوم (چیف انجینیر ٹیلیفون سعودی عرب) کے مکان پر لکھی گئی۔

سیرتِ محمدیؐ کا پیغام[1]

بیسویں صدی کی دنیا کے نام

جب ہمارے سامنے جاہلیت کا نام آتا ہے تو بے اختیار ہماری آنکھوں کے سامنے چھٹی صدی مسیحی کا وہ تاریک زمانہ تصویر کی طرح پھر جاتا ہے جس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور جس میں آپ کی ہدایت اور تعلیم کا سب سے پہلا اور سب سے نمایاں معجزہ ظاہر ہوا، جاہلیت کا لفظ سنتے ہی دفعۃً عرب قوم اپنی ان تمام جاہلی خصوصیات و اخلاق کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آتی ہے جن کا مرقع ہمارے سیرت نگاروں نے پیش کیا ہے۔

لیکن جاہلیت اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ دَور زمانۂ جاہلیت ہے جو وحی و نبوت کی رہنمائی سے محروم ہوا اور انبیاء علیہم السلام کی روشنی وہاں تک پہونچی ہی نہ ہو یا پہونچی ہو لیکن اس نے اپنی آنکھیں اس کی طرف سے بند کر لی ہوں، خواہ وہ چھٹی صدی عیسوی کی عالمگیر جاہلیت ہو یا یورپ کی تاریخ کی وہ تاریک متوسط صدیاں جو عموماً قرون مظلمہ (DARKAGES) کے نام سے یاد کی جاتی ہیں یا بیسویں صدی کا وہ روشن و تابناک عہدِ تہذیب و ترقی جس سے ہم گزر رہے ہیں۔

---

[1] یہ مضمون مجلس سیرت پشاور کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۶۳ء میں پڑھنے کے لئے اس کے سکریٹری حاجی عبدالرشید ارشد صاحب مرحوم کی دعوت پر لکھا گیا اور ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ کی طرف سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔

قرآن مجید ہم کو بتلاتا ہے کہ دنیا میں روشنی صرف ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہی ہے "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" البتہ تاریکیاں بے شمار ہیں ان کا حد و حساب نہیں اگر خدا کی روشنی کا (جو صرف انبیاء کے ذریعہ آتی ہے) اجالا نہ ہو تو دنیا کی ظلمتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں، زندگی کی ہر منزل اور اس کے ہر موڑ پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

كَظُلُمَاتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشَاهُ مَوْجٌ	جیسے گہرے دریا میں اندھیری چڑھی آتی ہے
مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ	اس پر ایک لہر اس پر ایک اور لہر اس کے اوپر
ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ	بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے
يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ	تو خود اپنا ہاتھ نہ دیکھنے پائے اور جس کو اللہ نے روشنی
اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ [1]	نہیں دی اس کے واسطے کہیں روشنی نہیں۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں نور اور ظلمت کا ایک ساتھ تذکرہ آیا ہے نور کو صیغۂ واحد کے ساتھ اور ظلمت کو جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلمتیں متعدد ہو سکتی ہیں لیکن نور ایک ہی ہوگا۔ اسی قدرتی روشنی کی اگر چمک نہ ہو تو پھر کسی مصنوعی روشنی سے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُجالا نہیں کیا جا سکتا، پھر یہ روشن اور جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع اور تاریک قبر ہے جس میں روشنی کا کوئی منفذ نہیں اور جہاں۔ ع

شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ	بھلا وہ جو مردہ تھا ہم نے اس کو زندہ کردیا
وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي	اور پس ہم نے اس کو روشنی دی کہ اس کے سہارے
النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمَاتِ	وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس کے برابر ہو سکتا ہے

---

[1] سورہ النور ۔ ۴۰

لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا[1] جس کا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں پڑا ہوا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی اس سرزمین تک (جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں بلکہ ڈوبتا ہے) نبوت کی روشنی بہت کم پہونچنے پائی، یہاں اس آسمانی روشنی کی خانہ پری ہمیشہ انسانی روشنی سے کرنے کی کوشش کی گئی، یونان اور روما کا عہدِ زریں انسانی علوم وفنون کی ترقی کے لحاظ سے بلاشبہ تاریخ کا درخشاں عہد ہے، لیکن نبوت کی تعلیمات وہدایت کے لحاظ سے اتنا ہی بے نور ہے جتنا تاریک سے تاریک دورِ جہالت ہو سکتا ہے، یہاں خدا کی ذات وصفات کے بارے میں بلا کسی روشنی اور رہنمائی کے محض قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے، "مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ" (ان کو اس کا ذرا بھی علم نہیں وہ محض اٹکل اور قیاس سے کام لیتے ہیں) الٰہیاتِ فلسفہ کا وہ طلسم جو ان ملکوں کے حکماء وفلاسفہ نے ترتیب دیا ہے، اپنی خیال آرائی، اعجوبہ زائی کے لحاظ سے مشرق کے طلسم ہوش ربا اور فسانۂ عجائب سے کم نہیں، سقراط وافلاطون (نہ کہ ارسطو) کے اقوال اور رواقی فلاسفہ کی اخلاقی تعلیمات میں انبیاء کی تعلیمات کے اثرات کی جھلک کہیں کہیں ضرور اس طرح نظر آجاتی ہے، جیسے برسات کی اندھیری رات میں کرمکِ شب تاب (جگنو) کی چمک جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء کی کچھ باتیں ان کے کان میں کبھی پڑی تھیں لیکن یہ روشنی اتنی تیز اور دیرپا نہیں کہ اس کے سہارے وہ اپنا سفر طے کر لیں "كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا" (جب (بجلی) چمکتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں، اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں)

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کا چراغِ ہدایت مشرق میں دو صدی تک بادِ مخالف کے

---

[1] سورۃ الانعام ۔ ۱۲۳

جھونکوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن مغرب میں قدر دانوں کے دامن تلے بجھ کر رہ گیا، یعنی حضرت مسیحؑ کی تعلیمات نے مغرب میں جاکر اپنی اصلیت کھودی، جہاں مسیحیت کو پہلی مرتبہ طاقت و حکومت حاصل ہوئی، شرک و بت پرستی کا دھارا مسیحیت کے بیچ دریا میں بہنے لگا، شاید دنیا کے کسی مذہب کے لئے کوئی نو مذہب اتنا نامبارک ثابت ہوا ہو جتنا مسیحیت کے لئے شہنشاہ قسطنطین اور سینٹ پال، مسیحیت کے اس الہامی چراغ کے گل ہو جانے کے بعد اربابِ کلیسا نے مذہبی مجلسیں سجا کر اور ان میں کافوری شمعیں جلا جلا کر صدیوں خوش اعتقاد مسیحی دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضرت مسیحؑ کی لائی ہوئی روشنی ان کے پاس موجود ہے لیکن یہ روشنی درحقیقت صدیوں پہلے تاریکیوں میں گم ہو چکی تھی۔

كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا	اس کی طرح جس نے آگ روشن کی جب
أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ	اس آگ سے اس کا گردو پیش روشن ہو گیا تو
بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ	اللہ نے ان کی روشنی اٹھالی اور ان کو تاریکیوں
لَا يُبْصِرُونَ [1]	میں اس طرح چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔

ان سب کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف واجب ہے کہ مسیحیت کی بدولت مغرب میں خدا کا اعتقاد اور آخرت کا خیال پایا جاتا تھا، حقیقت میں آسمانی مذہب کتنا ہی بدل جائے خدا اور آخرت کا خیال رگ وریشہ میں اس طرح جاری و ساری ہوتا ہے کہ کبھی اس سے نکل نہیں سکتا، پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں یورپ میں عقلیت مگر دراصل مادہ پرستی اور حواس پرستی کی جو تحریک پیدا ہوئی اس نے مغرب کو کھلے طریقہ پر مادہ پرستی کے راستہ پر لگا دیا، رفتہ رفتہ یورپ ایسا مادہ پرست ہو گیا کہ اس کی زندگی اور اس کے ذہنی نظام میں خدا اور آخرت کی

---

[1] البقرہ - ۱۷

گنجائش باقی نہیں رہی، سارے یورپ نے اپنی زبان سے خدا و آخرت کا انکار بالاعلان نہیں کیا، لیکن اس کی زندگی اس طرح کی ڈھل گئی کہ گویا نہ خدا ہے نہ آخرت، آج یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یورپ کا مذہب مسیحیت نہیں بلکہ مادیت ہے، یورپ عرصۂ دراز تک بُت پرست رہا ہے، اور عرصۂ دراز سے مسیحیت کا مدعی ہے، لیکن اس اخلاص اور جوش کے ساتھ اس نے اپنی ایسی گرویدگی اور شیفتگی کا اظہار کیا اور اس کی ایسی شدید پابندی کی جیسی مادیت کے اس مذہب کے ساتھ اس سے ظاہر ہو رہی ہے، اس نئے مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں (کارخانے، صنعتی و تجارتی مراکز اور تفریح گاہیں) شب و روز معمور ہیں، اس مذہب کے پروہت (ملک التجار، سرمایہ دار، صناع) بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، بلکہ ان کی پرستش کی جاتی ہے، اس کے بالمقابل عیسائیت مغرب میں سایہ بن کر رہ گئی ہے۔

مغرب میں اس خود فراموشی کے وہ سب نتائج ظاہر ہوئے اور ہو رہے ہیں، جو اس ذہنیت اور سیرت کا لازمی نتیجہ ہیں، ایک نتیجہ یہ ہے کہ مغربی انسان نے ایک خدا کا دامن چھوڑ کر دوسرے سیکڑوں خداؤں کا دامن پکڑ لیا ہے، ایک حقیقی آستانہ سے سر اٹھا کر جہاں سر جھکا کر وہ تمام آستانوں سے بے نیاز ہو سکتا تھا ہر سنگِ آستاں پر وہ اپنی پیشانی رگڑ رہا ہے، ایک خدا کو چھوڑ دینے کی سزا خدا کی طرف سے ہمیشہ یہی ملی ہے، یہ "اربابِ من دون اللہ" بڑی تعداد میں مغرب پر مسلط ہیں اور ساری مغربی دنیا ان کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہے، یہ کہیں سیاسی سردار ہیں کہیں اقتصادی دیوتا، کہیں اپنے تراشے ہوئے معیار زندگی، کہیں خود تجویز کئے ہوئے فرائض و لوازم زندگی، جنھوں نے اپنے پرستاروں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے، اور ان سے ایسی بندگی کرا رہے ہیں، جس کے سامنے خدا کی بندگی کی ہزار بار قدر آنی چاہیئے، ایسی مشقت لے رہے ہیں، جو بے زبان جانوروں اور بے جان مشینوں سے نہیں لی جاتی، ایسی قربانیاں کرا رہے ہیں، جو آج تک کسی دیوتا کے نام پر نہیں کی گئیں،

ان "ارباب من دون اللہ" کے مقاصد و خواہشات میں سخت تصادم و کشمکش ہے، ان کے متضاد مقاصد کی خاطر سارا عالم زیر وزبر ہو رہا ہے، ان بتانِ نو میں خاکِ وطن کا بھی ایک بڑا بت ہے جو ہمیشہ خون کی نذر اور انسانی جانوں کی بھینٹ چاہتا رہتا ہے، انھیں میں ایک بُت پیٹ ہے جس کی بندگی میں بیسویں صدی کا انسان رات دن لگا رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے راضی نہیں، کچھ مدت ہوئی سر آلیور لاج نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا۔

"زندگی کی سادگی اب خواب و خیال ہو گئی ہے، اب نہ کوئی مقصد سامنے ہے نہ اونچا تخیل، ہر شخص رات دن بیل کی طرح اپنے کارخانہ یا دفتر کی غلامی میں لگا ہوا ہے، تیز رفتار سواریوں کی ایجاد کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر وقت ہر شخص کے پیر پر گویا سنیچر سوار رہتا ہے۔"

خدا فراموشی کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود فراموش ہو گیا ہے، قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ۔[۱]	ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو خدا فراموش ہو گئے تو خدا نے ان کو خود فراموش بنا دیا۔

بیسویں صدی کا انسان خود فراموشی کا مکمل نمونہ ہے، اس نے اپنی حقیقت، اپنا انسانی امتیاز اپنا مقصد زندگی اور اپنی پیدائش کی غرض بالکل بھلا دی اور بالکل بہیمانہ یا جماداتی طرز زندگی اختیار کر لیا ہے، وہ ایک ایسی روپیہ ڈھالنے والی مشین بن گیا ہے، جو خود اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی حد یہ ہے کہ جسمانی راحت اور قلبی سکون و اطمینان جو اس جد و جہد کی کسی معنی میں قیمت ہو سکتا ہے، نہ اس کو اپنی زندگی میں میسر ہے، اور نہ اس کو اس کا ہوش باقی رہا ہے، پروفیسر جوڈ نے صحیح لکھا ہے

"جہاں تک ہمارے زمانہ کی سوسائٹی کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ تمدن نام ہے

---

[۱]

سرعت کا، سرعت زمانہ موجودہ کے نوجوان کا دیوتا ہے، اس کے آستانہ پر وہ سکون، راحت امن اور دوسروں کے ساتھ مہربانی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔"[1]

اس عالم خود فراموشی اور مدہوشی میں انسان کا موضوع ہی بدل گیا ہے، اس نے اپنے دائرۂ ترقی کو چھوڑ کر ترقی کے دوسرے دائروں میں بڑی ترقی کرلی ہے، لیکن کامل انسان کی حیثیت سے اس نے کوئی ترقی نہیں کی، بلکہ روز بروز اس کے انسانی خواص میں تنزل ہو رہا ہے، موجودہ ترقیات کا تجزیہ کیجئے، کچھ درندوں کے کمالات نکلیں گے، کچھ پرندوں کے اور کچھ مچھلیوں کے، ایک مغربی مصنف نے اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے، وہ کہتا ہے:۔

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو تفاوت ہے، اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے، ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا حال یہ ہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کرسکتے ہیں، سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے پھرتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ میلوں میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹے (BIG-BEN) کی آواز سنا کرتے ہیں، بچے ٹیلی فون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، برقی تصویریں آنے لگیں، بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے ہیں، بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جاسکتے ہیں، کھیتیاں بجلی سے پکائی جاتی ہیں، ربڑ کی سڑکیں بنتی ہیں، ایکسرے کے ذریعہ ہم اپنے جسم کے اندرونی حصہ کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں، تصویریں بولتی اور گاتی ہیں، لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا ہے، برقی موجوں سے بالوں میں پیچ و خم پیدا کیا جاتا ہے، بحری جہاز قطب شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک اڑ کر جاتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے

---

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS

بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام و حفاظت کے ساتھ کھیلیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں، اور نوے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے (PENDINE SANDS) پر تین سو یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے رکارڈ قائم کیا تھا، یا کسی ہوا باز نے ماسکو سے نیویارک کی مسافت مجھے یاد نہیں بیس گھنٹہ یا پچاس گھنٹہ میں طے کی تھی، جب میں سب کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں چڑیوں کی طرح اڑتے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا؛[1]

اس عالم خود فراموشی میں مغرب سے خدا فراموشی کا شکوہ ہی فضول ہے، وہ تو اقبال کے اس شعر کا صحیح مخاطب ہے ؎

زخود گریختۂ آشنا چہ می جوئی،
بہ آدمی نہ رسیدی خدا چہ می جوئی؟

اب مغرب کی آخرت فراموشی کو لیجئے، انکار آخرت کا پہلا اور طبعی اثر یہ ہے کہ دنیا وی زندگی اور دنیا کی چیزوں سے لذت و تمتع کا ایک جنون اور بحران پیدا ہو گیا ہے، تمتع ہی مقصد حیات قرار پا گیا ہے، آج مغرب کے ہر گوشہ سے صدائے نائے و نوش اور نعرہ "بعیش کوش" بلند ہو رہا ہے، اور اس کی ساری زندگی اس کے اور اس کے ذرائع کے حصول کی مسابقت میں صرف ہو رہی ہے، مسابقت نے زندگی کو ایک ایسا ریس کا میدان بنا دیا ہے، جس کا کوئی منتہا نہیں،

---

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS ص ۱۵

زندگی کی ایک نہ بجھنے والی پیاس اور ایک نہ مٹنے والی بھوک ہے ہر شخص کی زبان پر "ھَلْ مِنْ مَّزِیْد"
کی صدا ہے، زندگی کی ضروریات روز بروز بڑھتی جارہی ہیں، نفس کے مطالبات کی تکمیل کا سامان
اور اس میں تنوع روز بروز بڑھتا جارہا ہے اور اس نے صدہا اجتماعی دشواریاں اور مشکلات
پیدا کر دی ہیں، تاجرانہ رقابت اور مقابلہ نے اس میں امداد دی معیارِ زندگی روز بلند سے بلند تر
ہوتا جارہا ہے، یہاں تک کہ ہر شخص جب نظر اٹھاتا ہے منزلِ مقصود دور اور بامِ مقصود بلند
نظر آتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اس کے حصول کی تمنا اور کوشش میں بے کیف اور
بے لطف ہو جاتی ہے اور وہ حرص و طمع کے ایک مسلسل عذاب اور زندگی کی لا متناہی جد و جہد
میں مبتلا رہتا ہے، صبر و قناعت جو سکون و اطمینانِ قلب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، یورپ
میں عرصہ سے ناپید ہے۔

انکار آخرت یا آخرت کو فراموش کر دینے کے بعد لذت و تمتع کا یہ جذبہ جس کو ہم مسلمان دیوانگی سمجھتے ہیں منکر آخرت کے نقطۂ نظر سے عین فرزانگی ہے، جو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے تصور سے خالی ہو وہ اس زندگی میں لطف اٹھانے اور جگر کی آگ بجھانے میں کیوں کمی کرنے اور عیش و لطف کو کس دن کے لئے اٹھا رکھے اس لئے قرآن کہتا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ	کافر لطف اندوز ہوتے ہیں اور چوپایوں
کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی	کی طرح کھاتے ہیں اور جہنم ان کا ٹھکانا
لَّهُمْ۔[1]	ہے۔

دوسری جگہ کہتا ہے:۔

ذَرْهُمْ یَاْکُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا وَیُلْهِهِمُ	انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کھائیں

[1] محمد۔ ۱۲

الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝[1] | پئیں عیش وآرام کریں، امیدوں پر پھولے ہیں وہ وقت دور نہیں کہ انھیں معلوم ہو جائے گا۔

انکار آخرت کا دوسرا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور اس کی چیزیں، اس میں کام آنے والے اعمال، زیادہ آراستہ زیادہ معقول اور زیادہ مدلل نظر آتے ہیں، مادی ذہنیت اور سطحی نگاہ پیدا ہو جاتی ہے جو حقائق تک نہیں پہونچ سکتی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝[2]

بے شک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال ان کے لئے خوش نما بنا دیئے ہیں پس وہ بھٹک رہے ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝[3]

کہو ہم تمہیں خبر دیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں، وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور اس کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہوئے پس ان کے سارے کام اکارت گئے، اور اس لئے قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے۔

---

[1] الحجر ۳ [2] النمل ۴ [3] الکہف ۱۰۳-۱۰۵

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ زندگی میں حقیقت و سنجیدگی کا حصہ کم اور لہو و لعب کا حصہ زیادہ ہوتا جارہا ہے، زندگی کے ایک بڑے حصہ کو تفریحات اور سرور و نشاط کے اعمال و مشاغل گھیرے ہوئے ہیں، بڑے بڑے نازک وقتوں اور خطرات میں بھی ان کے اس تفریحی انہماک اور لطف اندوزی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔[۱]	چھوڑ دو ان کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے، اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ حوادث و واقعات کے حقیقی اسباب و علل پر ان کی نظر نہیں جانے پاتی بلکہ چند ظاہری چیزوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے، وہ معاملات کی گہرائی تک نہیں اتر سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہایت نازک وقت میں بھی ان کے تفریحی انہماک اور غفلت میں کمی نہیں ہوتی وہ ان واقعات کی کوئی تاویل کر لیتے ہیں اور ان کی کوئی فرضی اور حقیقی وجہ تلاش کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں، اور ان کے رویہ میں کوئی انقلابی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں مادّہ پرست اور ظاہر بیں قوموں کی نفسیاتی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ	اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی امتوں پر رسول بھیجے تھے پھر ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیا تاکہ وہ خدا کے حضور میں گڑگڑائیں پھر کیوں نہ گڑگڑائے جب ان پر ہمارا عذاب آیا لیکن (الٹے)

---

[۱] الانعام ۷۰

لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ[1] ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے کام ان کو آراستہ کر کے دکھائے۔

انکارِ آخرت کی ایک خاصیت تکبّر ہے، منکرِ آخرت کو متکبر ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی، جو اپنے سے کسی بالاتر طاقت اور اس زندگی کے بعد کسی زندگی اور روزِ جزا کا یقین نہیں رکھتا، اس کو ایک شترِ بے مہار اور ایک سرکش انسان بننے سے کیا چیز روک سکتی ہے، اس لئے قرآن مجید میں انکارِ آخرت کے ساتھ اکثر تکبر کا ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ یہ دونوں لازم و ملزوم سے ہیں۔

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ[2] جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل منکر اور وہ متکبر ہیں۔

فرعون اور اس کے لشکر کے متعلق کہا گیا۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ[3] فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق تکبر و انکار سے کام لیا اور وہ سمجھے کہ وہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

ایسی منکرِ آخرت اور مادہ پرست قوموں کا پنجۂ آہنی، ان کی گرفت ظالمانہ اور اُن کی فتح ایک زلزلہ ہوتا ہے جو ملکوں اور شہروں کو تہ وبالا کر دیتا ہے۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ[4] جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو زبردستوں اور ظالموں کی طرح ہاتھ ڈالتے ہو۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں اور وہاں کے سرداروں کو

---

[1] الانعام ۴۳ [2] النحل ۲۲ [3] القصص ۳۹ [4] الشعراء ۱۳۰

اَذِلَّةً[1] بے عزت کر ڈالتے ہیں۔

اسی طرح مغرب ایمان بالرسالۃ کی دولت سے بھی محروم رہا حضرت مسیحؑ کو اگرچہ اس نے ابن اللہ تسلیم کرلیا لیکن ان کو اپنی پوری زندگی کا رہنما اور رسولِ مطاع عملاً تسلیم نہیں کیا، یہ چیز صرف ایک نظری اور اعتقادی تھی، اس کے تسلیم کرنے سے زندگی اور اخلاق و اعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن ان کو اپنی زندگی کا رہنمائے کامل، ان کی سیرت کو اپنا مشعلِ زندگی اور ان کو اپنے لئے اسوۂ کامل ماننے سے زندگی کا رخ بدل جاتا، لیکن مغرب نے ایسا نہیں کیا اور نہ ایسا کرنا آسانی سے ممکن تھا، حضرت مسیحؑ کی زندگی کے صرف تین سال کے حالات اس کے پاس تھے، اور وہ بھی ایسے کہ زندگی میں ان کی تقلید و اقتدا بہت مشکل تھی، اگر اہلِ مغرب حضرت مسیحؑ کی سیرت و اقوال اور ان کی ہدایت و تعلیمات کو اپنی زندگی کا رہنما بنانا چاہتے تو ان کے لئے اس میں عملی دقتیں تھیں، مذہب مسیحی کے نمائندوں کے پاس ایسا کوئی مستند مذہبی سرمایہ نہ تھا جس کی مدد سے وہ ایک پوری قوم کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے، نہ وہ ایسی دینی حکمت و بصیرت رکھتے تھے، جس سے وہ مغرب کی نوخیز قوموں کو دنیاوی ترقی کے ساتھ مذہب کے دائرہ میں رکھ سکتے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی قوموں نے اپنی عملی زندگی حضرت مسیحؑ کی قیادت اور کلیسا کی نگرانی سے آزاد کرلی اور انھوں نے اس طرح کی زندگی گزارنی شروع کردی گویا وہ کسی پیغمبر کی امت نہیں ہیں، ان کے دماغوں اور دلوں پر حضرت مسیحؑ کی معصومانہ تعلیمات کا گہرا اثر نہیں پڑسکا، وہ اس اخلاقی تربیت اور تزکیہ سے محروم رہے جو پیغمبر کے پیرو حاصل کرتے ہیں، انھوں نے وسائل بکثرت حاصل کئے، لیکن خیر کا رجحان صرف پیغمبر کی تعلیمات کے اثر اور اس کی تربیت و اصلاح سے حاصل ہوسکتا ہے، مادی علوم و اکتشافات سے وہ نہ حاصل ہوسکتا تھا،

---

[1] النمل ۳۴

نہ ان کو حاصل ہو سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سارے وسائل اور یہ تمام طاقتیں جو خیر کے رجحان کے ساتھ عالم انسانی کی بہبودی کا سبب بن سکتی تھیں، زمین میں سربلندی اور فساد کا آلۂ کار بن گئیں اس لئے کہ ان کے استعمال کرنے والوں کے کان اس صدا سے ناآشنا ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا	وہ پچھلا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین
لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي	میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد نہیں
الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ	چاہتے اور انجام کار اللہ سے ڈرنے
لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ ؎	والوں کا ہے۔

اس خدا فراموشی، آخرت فراموشی، اور پیغمبروں کی تعلیمات سے استغنا و بے نیازی کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب آج اس قدر روشن ہے کہ اس کی رات بھی دن ہے، لیکن اس قدر تاریک ہے کہ دن بھی رات ہے، روشنی اور ترقی کے اس دور میں آج وہ سب کچھ پیش آرہا ہے جو وحشت و بربریت کے دور کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، بقول میر اکبر حسین الہ آبادی مرحوم ؎

لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

گذشتہ جنگ کے اختتام پر مسٹر لائڈ جارج نے کہا تھا:۔

"اگر حضرت مسیح اس دنیا میں تشریف لے آئیں تو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے، وہ ملاحظہ یہ فرمائیں گے کہ دو ہزار برس کے بعد بھی انسان فتنہ و فساد، کشت و خون، قتل و غارت میں بدستور مبتلا ہے، بلکہ اس وقت تو انسانیت کے جسم سے تاریخ کی عظیم ترین جنگ کے اثر سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں، اور زمین اس قدر تاراج ہو چکی ہے کہ نوبت

؎ القصص ۸۳

فاقہ کشی کی آگئی ہے، اور حضرت آ کر کیا دیکھیں گے؟ کیا اخوت و مساوات کے ساتھ لوگوں کو آپس میں ہاتھ ملاتے یا اس کے بالکل برعکس اس جنگ عظیم سے بھی بڑھ کر مہلک و پُر اذیت جنگ کی تیاریاں کرتے، ایک سے ایک بڑھ کر جان لیوا اور ستم کش آلاتِ ہلاکت ایجاد کرتے اور تعذیب کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے[1]"۔

اور دوسری جنگ کے آغاز پر مسٹر ایڈن نے فرمایا:۔

"جب تک کچھ کیا جائے اور خبر لی جائے، اس دنیا کے باشندے اس صدی کے پچھلے حصہ میں غاروں میں زندگی گزارنے والے دنیا کے قدیم وحشیوں کا طرزِ زندگی اختیار کر لیں گے اور اسی وحشت و بربریت کا دور شروع ہو جائے گا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں قائم تھا، کیسی عجیب بات ہے تمام ممالک ایک ایسے ہتھیار سے بچنے کے لئے کروروں روپیہ صرف کر رہے ہیں جس سے ہی تو سب کے سب خائف مگر اس کو قابو میں رکھنے پر راضی نہیں ہوتے ہیں، بعض اوقات تعجب سے سوچتا ہوں کہ اگر کسی دوسرے سیارہ سے کوئی سیاح اور زائر اس زمین پر آئے تو وہ ہماری دنیا کو دیکھ کر کیا کہے گا، وہ دیکھے گا کہ ہم سب اپنی ہی بربادی اور ہلاکت کے وسائل تیار کر رہے ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اس کے طریقِ استعمال کی اطلاع بھی دے رہے ہیں[2]"۔

آج ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی متمدن دنیا جس کی رہنمائی روم و ایران کی مشرقی شہنشاہیوں کے ہاتھ میں تھی، آج کی دنیا سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی، انسان پورے طور پر خدا فراموش ہو کر خود فراموش ہو گیا تھا، خدا کا اعتقاد ایک تاریخی نظریہ اور علم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا، لوگ صرف تاریخی طور پر یہ تسلیم کرتے تھے کہ اس عالم کو کسی زمانہ میں

---

[1] منقول از "سچ" [2] ایضاً

خدا نے پیدا کیا تھا۔" وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ" ـــــ لیکن عملی زندگی کا کوئی ربط اس سے باقی نہیں رہا تھا اور زندگی عملاً اس طرح گزر رہی تھی، گویا خدا نہیں ہے یا ہے تو (معاذ اللہ) گوشہ نشین اور دوسروں کی خاطر سلطنت سے دست بردار ہو چکا ہے، ساری زمین پر ارباب من دون اللہ کی عبادت و پرستش کا جال پھیلا ہوا تھا، کہیں بتوں کی پرستش تھی، کہیں قوم ونسل کی، کہیں ہوا وہوس کی، کہیں طاقت واقتدار کی، کہیں بادشاہ وسلاطین کی، اور کہیں احبار ورہبان (عالموں اور عابدوں) کی، انسان اپنی زندگی کا مقصد اور اس کا مبدا و منتہا فراموش کر چکا تھا، اور زندگی کے صحیح مشاغل بھول کر تدریجی خودکشی اور غلط مشاغل میں منہمک تھا، ساری دنیا پر ایک عالم خود فراموشی طاری تھا، اہل حکومت ظلم وجور، جبر واستبداد، مردم آزاری اور دولت ستانی میں مشغول تھے، امراء اپنے عیش و عشرت میں بدمست ہو رہے تھے، زندگی کا معیار اتنا بلند اور لوازم زندگی اتنے کثیر ہو گئے تھے کہ نئے نئے محاصل اور تاوانوں اور مظالم سے بھی پورے نہیں ہوتے تھے، معاشرت کا معیار اور زندگی کا تخیل اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ جس شخص کے پاس امارت کے لوازم نہ ہوتے اس کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں اس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا، زندگی کی گرانی اور ہم چشموں میں بااعتبار اور باوقار بننے کی فکر میں ہر شخص ہمیشہ ایک فکر وغم اور کوفت میں مبتلا رہتا، متوسط طبقہ کے لوگوں کو اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی نقالی اور ریس سے فرصت نہ ملتی، غربا کو محکومی اور غلامی اور نئے نئے محاصل کے بوجھ سے سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی، وہ اپنے آقاؤں کے عیش وآرام اور ان کے جائز وناجائز مطالبات کی تکمیل کے لئے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جُتے رہتے، جب کبھی اس سے چھٹی ملتی تو زندگی کا غم غلط کرنے کے لئے ناجائز تفریحات اور بدمستیوں سے دل بہلاتے، پورے پورے ملک

میں بعض اوقات ایک متنفس بھی ایسا نہ ہوتا جس کو اپنے دین اور آخرت کی فکر ہوتی اور موت کا خیال آتا، بے گناہ شہری حکومتوں کے حرص و آز اور ملک گیری کی ہوس کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پستے رہتے، ایرانی سلطنت نے بغیر کسی معقول وجہ اور ضرورت کے شام کی عیسائی سلطنت پر فوج کشی کی، اور نوے ہزار (۹۰۰۰۰) بے گناہ انسانوں کے خون سے اللہ کی زمین رنگین کی، اس کے جواب میں رومی سلطنت نے ایرانی سلطنت کو زیر و زبر کر دیا اور پُرامن شہریوں کا انتقام پُرامن شہریوں سے لیا، بلا کسی بلند مقصد اور اخلاقی مہم کے اس خونیں جنگ کا سلسلہ برسوں جاری رہا اور دنیا کی دو متمدن سلطنتوں کے باشندے اور مہذب و متمدن ترین انسان وحشیوں کی طرح ایک دوسرے سے دست و گریبان رہے، پورے کرۂ ارض پر اس وقت اندھیرا چھایا ہوا تھا، اور انسان کی غلط کاریوں کی وجہ سے ایک عالمگیر ابتری اور ہمہ گیر خرابی پھیلی ہوئی تھی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (الروم ۴۱)

اس وقت اس متمدن دنیا (جس کو پورے طور پر گھن لگ چکا تھا) سے الگ لیکن اس کے بالکل قریب اور ان دونوں حریف مشرقی و مغربی شہنشاہیوں کے بیچ میں اللہ تعالیٰ نے اُمیّوں کے درمیان ایک امی پیغمبر کو مبعوث فرمایا تاکہ دنیا کو اس عذاب سے نجات دے جس میں وہ صدیوں سے مبتلا تھی، اور آخرت کے اس عذاب سے ڈرائے جو پیش آنے والا ہے، تاریکیوں سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کرے اور تمام زنجیریں اور بیڑیاں کاٹے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ	(وہ نبی امی) انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے
عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ	برائی سے روکتا ہے، پسندیدہ چیزیں حلال

وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَ	کرتا ہے، گندی چیزیں حرام ٹھہراتا ہے،
يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ	اس بوجھ سے نجات دلاتا ہے جس کے تلے
الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ[1]	وہ دبے ہوئے ہیں، ان پھندوں سے نکالتا
	ہے جس میں وہ گرفتار ہیں۔

اس نبی اُمی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ۷ھ (۶۳۰ء) میں رومی شہنشاہ (ہرقل) کو مدینہ سے ایک خط اور پیغام بھیجا، دعوت یہ تھی۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ	اے اہلِ کتاب ایک ایسی بات کی طرف
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ	آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ بندگی
وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ	نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور اس کا کسی کو
بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ	شریک نہ ٹھہرائیں اور کوئی کسی کو اللہ کے
اللَّهِ ؕ[2]	سوا رب نہ بنائے۔

ہرقل نے اس دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا، لیکن وہ اپنی کمزوری سے اس ربوبیت سے دست بردار نہ ہو سکا جس سے وہ متمتع ہو رہا تھا۔ اس طرح رومی زندگی کے اس عذاب سے اس وقت تک نجات حاصل نہ کر سکے جب تک مسلمان مجاہدوں نے شام و روم کے ممالک کو اپنے سایۂ رحمت میں نہیں لے لیا۔

لیکن عرب کی درماندہ قوم نے نبی امی صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول کر لیا اور وہ ساری نعمتیں حاصل کیں جو اس پیغام کا نتیجہ ہیں، ان کی غلامی کی تمام زنجیریں خود بخود کٹ گئیں، خدا کے آستانہ پر سر جھکا کر وہ دنیا کے تمام آستانوں سے بے نیاز ہو گئے، نہ نفس کی بندگی رہی نہ بادشاہوں

---

[1] الاعراف ۱۵۷ [2] آل عمران ۶۴

اور حکومتوں کی غلامی کی، نہ جاہلانہ رسم ورواج اور معاشرت اور سوسائٹی کی سابق ظالمانہ بندشیں، نہ اپنی لائی ہوئی اور نہ دوسروں کی ڈالی ہوئی مصیبتیں، خداشناسی اور خدا کی عظمت وکبریائی کے علم نے دنیا کے مصنوعی خداؤں کی عظمت کا طلسم توڑ دیا اور ان کو ان کی نظر سے گرا دیا، عرب کے یہ فاقہ مست، دریدہ پیرہن، گلیم پوش اعرابی جو کبھی اپنے صحرا اور بادیہ سے باہر نہیں نکلے تھے، اور جنھوں نے شان وشوکت کا کوئی مظاہرہ نہیں دیکھا تھا، شاہانِ عجم سے اس طرح آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بے تکلف باتیں کرتے تھے، اور ان کے درباری کر وفر کو اس بے پرواہی اور تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے، گویا مٹی کی مورتیں اور کاغذ کے کھلونے ہیں جن کو جھنڈیوں سے آراستہ کر دیا گیا ہے، وہ ایسے حقیقت شناس ہوگئے تھے کہ شان وشوکت کے کھوکھلے مظاہر ان کو ذرا متاثر نہ کرتے اور کہیں وہ اپنے اصول اور اعلیٰ اخلاقی معیار سے ذرا بھی انحراف کرنا پسند نہ کرتے، وہ اپنے کو خدا کے بندوں کو دوبارہ خدا کی بندگی میں داخل کرنے اور انسانوں کی خدائی کا طلسم توڑنے پر مامور ومبعوث سمجھتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایرانیوں کے سپہ سالار اعظم اور امیر رستم کی فرمائش پر ربعی بن عامر کو بطور سفیر کے بھیجا، ایرانیوں نے بڑے ٹھاٹ کے ساتھ دربار سجایا، زریں قالین اور ریشمی فرش بچھائے، یاقوت اور آبدار موتیوں کی چمک سے نظر نہیں ٹھہرتی تھی، رستم کے سر پر تاجِ زریں اور جسم پر زرنگار پوشاک سونے کے تخت پر جلوہ افروز تھا، ربعی اس شان سے دربار میں داخل ہوئے کہ جسم پر موٹے موٹے کپڑے، ہاتھ میں تلوار و سپر، رانوں کے نیچے کوتاہ قامت گھوڑا، وہ اسی شانِ بے نیازی کے ساتھ دربار میں آگئے، گھوڑے سے اتر کر امرائے دربار کے ایک گاؤ تکیہ سے گھوڑے کو باندھ دیا، زرہ پوش ہتھیار بند مجلس میں آئے، چوبداروں نے عرض کیا ہتھیار رکھ دیجئے، کہا میں اپنے شوق سے نہیں آیا تمہارا بلایا ہوا آیا ہوں اگر تمہیں اس طرح میرا آنا

منظور نہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں، رستم نے کہا آنے دو، ربعی قالینوں پر اپنے نیزہ کو چبھوتے ہوئے اور اس سے عصا کا کام لیتے ہوئے اس طرح بے تکلف بڑھتے چلے گئے کہ قالین جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گئے، اور جاکر رستم کے پاس بیٹھ گئے، رستم نے پوچھا کہ آپ کا اس ملک میں آنے کا مقصد کیا ہے، انھوں نے کہا کہ اللہ نے ہم کو اس کام کے لئے مقرر کیا ہے کہ ہم اس کے حکم سے اس کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں، دنیا کی تنگی سے نجات دے کر وسعت و کشادگی میں، مذاہب کے ظلم و جور سے بچا کر اسلام کے عدل و انصاف میں داخل کریں، اس نے ہم کو اپنی مخلوق کی طرف اپنے دین کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ ہم اس دین کی دعوت دیں اگر وہ اس کو مان لے تو ہم.......... واپس چلے جائیں، اور جس کو اس سے..... انکار ہو اس سے ہم ہمیشہ لڑتے رہیں، یہاں تک کہ ہم کو اللہ کا انعام مل جائے، رستم نے کہا وہ انعام کیا ہے؟ کہا جو اس راستہ میں مر جائے اس کے لئے جنت اور جو زندہ رہ جائے اس کے لئے اس کی نصرت، رستم نے کہا میں نے آپ کی بات سن لی، کیا آپ ہم کو اس کی مہلت دے سکتے ہیں کہ ہم ارکانِ سلطنت سے مشورہ کرلیں، کہا ہاں، آپ کو کتنی مہلت چاہیئے، ایک دن یا دو دن، کہا اتنے تھوڑے وقت میں کیا ہوگا، ہمیں خط و کتابت کرنی پڑے گی اور رائے معلوم کرنی ہوگی، ربعی نے کہا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دشمن سے مقابلہ کرتے وقت تین دن سے زیادہ مہلت دینے کی نظیر نہیں چھوڑی، اس لئے اس معاملہ پر جلد غور کرلیجئے، اور تین چیزوں (اسلام، جزیہ اور جنگ) میں سے کسی ایک چیز کو انتخاب کرلیجئے، رستم نے کہا آپ مسلمانوں کے سردار ہیں، ربعیؓ نے کہا نہیں، مسلمان سب جسم واحد ہیں، ان میں سے سب سے ادنیٰ کو بھی سب سے اعلیٰ کے مقابلہ میں پناہ دینے کا حق ہے۔

ایک سفارت میں حضرت مغیرہؓ گئے، اس دن دربار کی نئی شان تھی، ایرانیوں نے اپنی شان و شوکت اور دولت و حشمت کا انتہائی مظاہرہ کیا تھا، مغیرہؓ بے تکلف صدر کی طرف

بڑھتے ہوئے صدر مجلس (رستم) کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے، ایرانیوں نے یہ منظر کہاں دیکھا تھا، تاب نہ لا سکے اور بازو پکڑ کر تخت سے اتار دیا، مغیرہ نے کہا کہ مہمان کے ساتھ تو یہ سلوک مناسب نہ تھا، ہم لوگوں میں یہ دستور تو نہیں کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھ جائے اور تمام لوگ اس کے آگے بندوں کی طرح کھڑے ہوں، ان کی اس بے باکانہ گفتگو کا جب ترجمہ کیا گیا تو دربار پر سناٹا چھا گیا اور لوگوں نے اعتراف کیا کہ ہماری ہی غلطی تھی۔

ایک رومی دربار میں حضرت معاذ بن جبلؓ سفیر بن کر گئے، دربار میں دیبائے زریں کا فرش بچھا تھا، معاذ زمین پر بیٹھ گئے اور کہا کہ میں اس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر تیار ہوا ہے بیٹھنا نہیں چاہتا، عیسائیوں نے کہا کہ ہم تمہاری عزت کرنا چاہتے تھے، لیکن ہم کیا کریں تم کو خود اپنی عزت کا خیال نہیں، معاذ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے اور کہا جس کو تم عزت سمجھتے ہو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں، اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے تو مجھ سے بڑھ کر کون خدا کا غلام ہو سکتا ہے، ایک شخص نے پوچھا کہ مسلمانوں میں تم سے کوئی بڑھ کر ہے، معاذ نے کہا معاذ اللہ یہی بہت ہے کہ میں سب سے بدتر نہ ہوں، رومیوں نے اپنے بادشاہ پر فخر کیا، معاذ نے کہا کہ تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے، لیکن ہم نے جس کو اپنا حاکم بنا رکھا ہے، وہ کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا، اگر وہ زنا کرے تو اس کو درے لگائے جائیں، چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں، وہ پردہ میں نہیں بیٹھتا، اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا، مال و دولت میں اس کو ہم پر کوئی ترجیح نہیں۔

اس ذہنی انقلاب سے جو ایک خدا کو اپنا معبود حقیقی اور رب مان لینے سے پیش آیا، ان کی زندگی سراسر تبدیل ہو گئی، جو بہائم صفت تھے، وہ فرشتہ خصلت انسان بن گئے، جو غارت گر اور رہزن تھے، وہ دوسروں کے جان و مال اور عزت و ناموس کے محافظ بن گئے، جو جانوروں

کے پہلے اور پیچھے پانی پینے اور پلانے پر خون کی ندیاں بہا دیتے تھے، وہ دوسروں کی خاطر پیاسا مرجانا پسند کرنے لگے، جو اپنی بچیوں کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے، وہ دوسروں کی بچیوں کی پرورش کے لئے اپنی گودیں خالی کرنے لگے، جو دوسروں کے مال کو اپنا مال سمجھتے، وہ اپنا مال بھی دوسروں کا مال سمجھنے لگے جن کو دن کی روشنی میں لوگوں کا مال لوٹ لینے میں باک نہ تھا، وہ رات کی تاریکی میں شاہ ایران کا تاج زریں جو لاکھوں روپے کی مالیت کا تھا۔ اپنے کمبل میں چھپا کر امیر کے پاس پہونچا دیتے تھے۔

خدا طلبی نے دنیا طلبی اور رزق طلبی کے اس بحران اور جوش کو سرد کر دیا جس نے دنیا کی عافیت تنگ کر دی تھی، اور دنیا کو محض ایک بازار اور منڈی بنا دیا تھا، مسابقت کا وہ فطری جذبہ جو انسان کی دبی ہوئی قوتوں کو ابھارتا اور اس کے جوہروں کو چمکاتا ہے جس نے پہلے دنیا کی طرف متوجہ ہو کر زندگی کو ایک غیر مختتم کشمکش بنا دیا تھا، اور بھائی بھائی میں رقابت پیدا کر دی تھی، دین کی طرف متوجہ ہو کر اس نے شریفانہ انسانی خصائل کو اُبھار دیا اور سیرت کو پاکیزہ بنا دیا مختلف انسانی طبقات اور ان طبقوں کے مختلف افراد میں اب بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش تھی، مگر نیک کرداری اجر و ثواب اور خدا کی مغفرت و رضا کے حصول میں، غربا نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ہمارے دولت مند بھائی ہم سے آگے بڑھے جا رہے ہیں، نماز، روزہ وہ ہماری طرح کرتے ہیں، اور صدقہ اور خیرات میں ہم ان کی برابری نہیں کر سکتے، آپؐ نے ان کو ایک ذکر بتلا دیا، دولت مندوں نے سنا تو انھوں نے بھی وہی پڑھنا شروع کر دیا غربا نے آکر پھر عرض کیا کہ ہم تو پھر پیچھے رہ گئے، ہمارے دولت مند بھائیوں نے بھی وہی پڑھنا شروع کر دیا، جو آپ نے ہم کو بتلا دیا تھا، آپ نے ان کو تسکین دی، زہد و قناعت نے دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیا جس میں "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" کی جھلک نظر آتی تھی،

مال کی طمع اور حرص و منافست کے دور ہو جانے سے قلوب میں ایسی الفت اور محبت پیدا ہو گئی تھی، کہ "نَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ" (ہم نے ان کے سینے کے کھوٹ کو نکال دیا) کا منظر جو اہل جنت کی صفت ہے، دنیا میں نظر آنے لگا، حقوق طلبی کے بجائے فرض شناسی اور طمع کے بجائے ایثار کا ایسا مادہ پیدا ہو گیا تھا کہ "يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" کا نظارہ دیکھنے والوں کو نظر آیا اور چشم فلک نے حیرت کے ساتھ یہ سماں دیکھا کہ میزبان نے بچوں کو بھوکا سلا کر اور چراغ بجھا کر مہمانوں کو یقین دلایا کہ وہ ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہے، مہمان شکم سیر ہو کر اٹھے اور میزبان بیوی بچوں سمیت رات بھر بھوکا رہا۔

یہ ساری اصلاح اور یہ ساری ترقی نتیجہ تھی اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کر لینے، اپنے کو اس کے حوالہ کر دینے اور خود کو ایک معصوم پیغمبر کی نگرانی اور تربیت میں دینے کا، اس سے گویا ان کی زندگی کی چول بیٹھ گئی اور ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھیک آگئی۔

مسیحی دنیا نے اس پیغام کی قدر نہ کی اس کا مشرقی حصہ تو بہت جلد ان لوگوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا جو اس پیغام کے حامل اور اپنے پیغمبر کے جانشین تھے، لیکن اس کا مغربی اور شمالی حصہ (یورپ) مجاہدین و داعیان اسلام کے حلقہ سے باہر رہا، اس نے پوری نو صدیاں (یا ایک ہزار سال) جہالت اور ظلمت کے اس دور میں گزاریں جس کو وہ خود اپنی زبان سے قرون مظلمہ (DARK AGES) کہتا ہے، انسانی تاریخ کا یہ طویل زمانہ جو وحشت و جہالت، عقل دشمنی اور اوہام پرستی، رہبانیت کی مردم آزاری اور آدم بیزاری، ارباب کلیسا کی آتشیں دار و گیر اور ظالمانہ احتساب کی نذر ہوا اس کا افسوس یورپ کو ہمیشہ رہے گا اور اس کی ندامت سے اس کی گردن ہمیشہ جھک جانی چاہیے، یہ سب کرشمہ تھا مخلوق پرستی کا۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ انھوں نے اپنے عالموں راہبوں اور

اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ۔[۱] (حضرت) مسیح کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنا لیا۔

سولہویں صدی میں جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے خیال کیا کہ اس کی ساری مصیبتوں کا علاج یہ ہے کہ وہ کلیسا کی غلامی سے نجات حاصل کرلے لیکن اس نے لَا اِلٰہَ کی پوری منزل طے نہیں کی؛ اس نے لَا کَلِیْسَا کو لَا اِلٰہَ کا مرادف سمجھا اور اس کی نفی کرکے اور دوسرے الٰہ اپنے اوپر مسلط کرلئے، اور اِلَّا اللّٰہ کا تو اس نے آغاز ہی نہیں کیا، مغرب اپنی اہم ترین تاریخ کی ان تین صدیوں میں اپنے ایک پسندیدہ الٰہ سے روٹھ کر دوسرے نئے نئے آلہہ تراشتا رہا اور "اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ" (کیا تم جن کو اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو، انھیں کی پرستش کرنے لگتے ہو) کا منظر نظر آتا رہا، آج بھی وہ اپنے بہت سے قدیم الٰہ سے بیزار نظر آتا ہے لیکن دوسرے الٰہ باطل تراشتا جارہا ہے ان میں کسی الٰہ کا نام جمہوریت ہے کسی کا نام آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کسی کا نام سرمایہ داری کسی کا نام اشتراکیت، کسی کا نام قومی اشتراکیت، کسی کا نام قوم اور کسی کا نام وطن ہے، مغرب اپنی زندگی کے نقشے اُدھیڑ اُدھیڑ کر بناتا اور اپنی زندگی کی گھڑی کے پُرزے بکھیر بکھیر کر جاتا ہے، لیکن اس کی چول نہیں بیٹھتی، اس الجھی ہوئی ڈور کو وہ برسوں سے اپنے ناخن تدبیر سے سلجھا رہا ہے، لیکن جس قدر سلجھانے کی کوشش کرتا ہے، وہ الجھتی جارہی ہے، یہاں تک کہ اب اس میں خود اس کی انگلیاں اس طرح پھنس گئی ہیں کہ نکلتی نہیں۔

وہ زندگی کے ہزار نقشے بنائے اور ان میں ہزار ترمیمیں کرے اور ان کے نئے نئے نام رکھے ایک شخص کی ذمہ داری بہت سے اشخاص پر منقسم کردے یا بہت سے اشخاص کی ذمہ داری ایک منتخب ترین اور ذمہ دار ترین فرد پر ڈال دے اور اس شخص کو صدہا قیود و

---

[۱] التوبہ ۳۱

ضوابط سے جکڑ دے لیکن جب تک اس جسم کا قلب نہیں بدلتا، وہ ذمہ دار ایک فرد ہو یا کوئی جماعت یا پوری قوم جب تک اپنے کو ایک بالاتر طاقت علیم و بصیر کے سامنے ذمہ دار نہیں سمجھتی، اس کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی بازپرس کا کھٹکا نہیں، خیر کا رجحان اور نیکی و امانت کا شعور نہیں، اس وقت تک محض ناموں کی تبدیلی سے اور قوانین و ضوابط سے حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

سیرت محمدیؐ کا اصل پیغام اس بیسویں صدی کی دنیا کے نام جس کی قیادت آج مغرب کے ہاتھ میں ہے، یہ ہے کہ اے اللہ سے بھاگنے والو اللہ کی طرف بھاگو اور اس کے سوا کسی کو الٰہ نہ بناؤ۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ[1]	پس بھاگو۔ اللہ کی طرف، بے شک میں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ، بے شک میں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

یہ پیغام محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہر سال دنیا کو سناتی ہے، اور دنیا کے گوشہ گوشہ تک یہ دعوت پہونچاتی ہے، ہوا اپنے کاندھوں پر اور سمندر اپنے سر آنکھوں پر رکھ کر ہر سال اس پیغام اور دعوت کو دنیا کے ملکوں اور قوموں کو پہونچاتا ہے اور دنیا کا یہ شور جو کچھ سننے نہیں دیتا اگر ذرا کم ہو تو اب بھی کان میں یہ آواز آ رہی ہے، جس کو پہلی صدی کے اہلِ کتاب نے سنا تھا۔

---

[1] الذّٰریات ۵۰-۵۱

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ	تمہارے پاس ایک روشنی آئی اور ایک
وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ	کھلی ہوئی کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ ہدایت
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ	کرتا ہے۔ اس کی جو اس کی رضا کا پیرو ہو
وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى	سلامتی کے راستوں کی اور ان کو نکالتا ہے
النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى	تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور ان کو
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ [1]	ہدایت کرتا ہے سیدھے راستہ کی۔

پیغمبر ہی انسانی جہاز کے ناخدا ہیں، انسانوں کی کشتی ہر زمانہ میں انھیں کی ناخدائی سے ساحل تک پہونچی ہے، صرف حضرت نوحؑ کے فرزند ہی کی خصوصیت نہ تھی، ہر زمانہ میں جس نے بھی دعویٰ کیا کہ "سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ" (میں تو پہاڑ پر پناہ لے کر طوفان سے محفوظ رہ جاؤں گا) اس کو یہی جواب ملا "لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ" (آج کوئی بچانے والا نہیں) محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد افراد اور قوموں، اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب، اولین و آخرین سب کے لئے اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ سعادت و فلاح انھیں کے دامن سے وابستہ ہے ان سے علیحدہ ہو کر شقاوت اور ہلاکت، محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں ؎

محمدؐ عربی کآبروئے ہر دو سرا ست
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

---

[1] المائدہ ۱۶/۱۵

سیرت کا پیغام
موجودہ دور کے مسلمانوں کے نام

سب جانتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی دنیا کچھ ویران اور کوئی قبرستان نہ تھی، زندگی کا چکر جس طرح اس وقت چل رہا ہے، بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس وقت بھی چل رہا تھا، سارے کاروبار آج کی طرح ہو رہے تھے، تجارت بھی تھی، زراعت بھی تھی، اور حکومتوں کا نظام چلانے والے اور ان کی مشنری میں فٹ ہونے والے بھی موجود تھے، اس وقت کی دنیا کے لوگ اس زندگی پر بالکل قانع اور مطمئن تھے، اور ان کو اس میں کسی ترمیم یا اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین کا نقشہ اور دنیا کی یہ حالت بالکل پسند نہ تھی، حدیث میں اس زمانہ کے متعلق ہے "إِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ إِلَىٰ أَهْلِ الْأَرْضِ فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ إِلَّا بَقَايَا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ" (اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین پر نظر ڈالی اس نے روئے زمین کے تمام باشندوں کیا عرب کیا عجم سب کو بے حد ناپسند فرمایا اور وہ ان سے بیزار ہوا، سوائے اہلِ کتاب کے چند افراد کے) ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپؐ کے ساتھ ایک پوری قوم کے ظہور کا سامان کیا، ظاہر ہے کہ ان کو کسی ایسے مقصد کے لئے پیدا کیا تھا، جو دوسری قوموں سے پورا نہیں ہو رہا تھا، جو کام وہ سب پورے انہماک اور شوق کے ساتھ انجام دے رہے تھے، اس کے لئے ظاہر ہے کہ کسی نئی اُمت کو پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی، اور انسانی زندگی کے اس پرسکون سمندر میں اس نئے تلاطم کی حاجت نہ تھی، جو مسلمانوں کے وجود سے ظہور میں آیا اور جس نے زمین میں ایک زلزلہ ڈال دیا، اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ تسبیح و تقدیس کے لئے ہم نیاز مند بہت کافی تھے، اس کے لئے

اس خاکی پتلہ کو پیدا کرنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا،" اِنِّیٓ اَعۡلَمُ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ " گویا اشارہ فرمایا (اور آگے چل کر واضح کر دیا) کہ آدمؑ صرف اسی کام کے لئے پیدا نہیں ہوئے جو ملائکہ انجام دے رہے تھے، ان سے خدا کو کچھ اور کام لینا ہے۔

اگر مسلمان صرف تجارت کے لئے پیدا کئے جا رہے تھے تو مکہ کے ان تاجروں کو جو شام و یمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے، اور مدینہ کے ان بڑے بڑے یہودی سوداگروں کو جن کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے، یہ پوچھنے کا حق تھا کہ اس خدمت کے لئے ہم گنہگار کیا کم ہیں کہ اس کے لئے ایک نئی امت پیدا کی جا رہی ہے، اگر زراعت مقصود تھی تو مدینہ اور خیبر کے، طائف اور نجد کے، شام اور یمن اور عراق کے کاشت کاروں اور زراعت پیشہ آبادی کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ کاشتکاری اور زراعت میں ہم محنت و کوشش کا کون سا دقیقہ اٹھا رکھتے ہیں کہ جس کے لئے ایک نئی امت کی بعثت ہو رہی ہے، اگر دنیا کی چلتی ہوئی مشنری میں صرف فٹ ہونا تھا، اور حکومتوں کے نظم و نسق اور دفتری کاروبار کو معاوضہ لے کر چلانا تھا تو روم و ایران کے کارپردازانِ سلطنت کو یہ کہنے کا حق تھا کہ اس فرض کی انجام دہی کے لئے ہم بہت ہیں، اور ہمارے بہت سے بھائی بے روزگار ہیں، اس کے لئے نئے امیدواروں کی کیا ضرورت ہے۔

لیکن درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لئے پیدا کئے جا رہے تھے، جو دنیا میں کوئی نہ انجام دے رہا تھا، اور نہ دے سکتا تھا، اس کے لئے ایک نئی امت ہی کی بعثت کی ضرورت تھی چنانچہ فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی،
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ	بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو
بِاللّٰهِ۔ (آل عمران ۱۱۰)	اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اسی مقصد کی خاطر لوگ وطن سے بے وطن ہوئے اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنا عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی جمائی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا، اپنے عیش و تنعم کو خیرباد کہا، دنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں سے آنکھیں بند کر لیں،

اور زریں موقعے کھو دیے، پانی کی طرح اپنا خون بہایا، اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کیا، ان مقاصد و مشاغل کے لئے جن پر آج مسلمان قانع نظر آتے ہیں اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی ضرورت نہ تھی، اس کے حصول کا راستہ تو بالکل بے خطر اور ہموار تھا اور اس راستہ پر معاصر دنیا سے کوئی بڑی کشمکش اور تصادم نہیں تھا، اور نہ یہ اہلِ عرب اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے وجہ شکایت تھی، انھوں نے تو بار بار انھیں چیزوں کی پیش کش کی (جو آج عام مسلمانوں کا منتہا ہے) اور ہر بار اسلام کے داعی نے ان کو ٹھکرایا، دولت و سرداری، عیش و عشرت اور راحت و تن آسانی کی بڑی پیش کش کو نامنظور کیا، پھر اگر مسلمان کو اسی سطح پر آجانا تھا جس پر زمانہ بعثت کی تمام کافر قومیں تھیں، اور اس وقت بھی دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی ہے، اور زندگی کے انھیں مشاغل میں منہمک اور سرتاپا غرق ہو جانا تھا جن میں اہل عرب اور رومی و ایرانی ڈوبے ہوئے تھے، اور انھیں کامیابیوں کو اپنا منتہائے زندگی بنالینا تھا جن کو ان کے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) ان کے بہترین موقع پر رد کر چکے تھے تو یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مرادف ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر و حنین و احزاب اور قادسیہ و یرموک میں بہایا گیا، بے ضرورت بہایا گیا۔

آج اگر سرداران قریش کو کچھ بولنے کی طاقت ہو تو مسلمانوں کو خطاب کرکے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم جن چیزوں کے پیچھے سرگرداں ہو اور جن چیزوں کو تم نے اپنا حاصل زندگی سمجھ رکھا ہے انھیں چیزوں کو ہم گنہگاروں نے تمہارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سامنے پیش کیا تھا، وہ تمام چیزیں اس وقت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل ہو سکتی تھیں تو کیا ساری جدوجہد کا حاصل اور ان تمام قربانیوں کی قیمت وہ طرزِ زندگی ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے، اور زندگی و اخلاق کی وہی سطح ہے جس پر تم نے قناعت کر لی ہے، اگر ان سرداران قریش میں سے جو اسلام کے

حریف تھے، کسی کو یہ جرح کرنے کا موقع ملے تو آج ہمارا کوئی بڑے سے بڑا لائق وکیل بھی اس کا تشفی بخش اور مسکت جواب نہیں دے سکتا اور اُمت کے لئے اس پر شرمندہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے متعلق یہی خطرہ تھا کہ وہ دنیا میں پڑ کر اپنا مقصد نہ بھول جائیں، اور دنیا کی عام سطح پر نہ آجائیں، آپ نے وفات کے قریب جو تقریر فرمائی اس میں مسلمانوں کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا:۔

ما الفقر اخشٰی علیکم ولکنی	مجھے تمہارے بارے میں کچھ فقر و افلاس کا خطرہ
اخشٰی ان تبسط علیکم الدنیا	نہیں ہے، مجھے تو اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں
کما بسطت علٰی من کان قبلکم	تم کو بھی وہی کشائش نہ حاصل ہو جائے جیسی تم سے
فتنافسوھا کما تنافسوھا	پہلے لوگوں کو حاصل ہوئی تو تم بھی اسی طرح اس میں
فتھلککم کما اھلکتھم۔[1]	حرص و مقابلہ کرو جیسے انھوں نے کیا تو تم کو بھی اسی طرح
	ہلاک کردے جیسے اُن کو ہلاک کیا۔

مدینہ کے انصاریوں نے جب اس بات کا ارادہ کیا کہ جہاد کی مشغولیت اور اسلام کی جدوجہد سے کچھ دنوں کی فرصت حاصل کرکے اپنے باغوں کھیتوں اور کاروبار کو درست کرلیں اور کچھ مدت کے لئے صرف اپنے کاروبار میں مشغول ہونے کی اجازت حاصل کرلیں، یہ خطرہ بھی ان کے دل میں نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ ارکانِ دین نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ سے بھی کچھ دنوں کے لئے اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لئے اپنے آپ کو مستثنٰی کرالیں لیکن اسلام کی عملی جدوجہد اور دین کے فروغ اور اس کے غلبہ کی کوشش سے ان کی اس عارضی یکسوئی کو بھی خودکشی کا مرادف قرار دیا گیا اور سورۂ بقرہ کی آیت نازل ہوئی جس کی تفسیر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کی ہے۔

---

[1] بخاری و مسلم۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝[۱]

اللہ کے راستہ پر خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور اچھی طرح کام کرو بیشک اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

مسلمان کی زندگی کی اصلی ساخت یہی ہے کہ یا تو اسلام کی دعوت اور عملی جدوجہد میں مشغول ہو، یا اس دعوت وعملی جدوجہد میں مشغول ہونے والوں کے لئے پشت پناہ ومددگار ہو، اس کے ساتھ بھی عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا عزم اور شوق رکھتا ہو، مطمئن شہری اور محض کاروباری زندگی اسلامی زندگی نہیں، اور کسی طرح بھی یہ ایک مسلمان کا مقصود حیات نہیں ہو سکتا، جائز مشاغل زندگی، جائز وسائل معیشت ہرگز ممنوع نہیں، بلکہ نیت واجر طلبی کے ساتھ عبادت وقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں، مگر یہ جب سب دین کے سایہ میں ہوں اور صحیح مقاصد کا وسیلہ ہوں نہ کہ خود مقصود بالذات۔

سیرت محمدیؐ کا یہ سب سے بڑا پیغام ہے، جو خالص مسلمانوں کے نام ہے، اس کی طرف توجہ نہ کرنا اس کے مقصد کو ضائع کرنا اور سب سے بڑی حقیقت کی طرف سے چشم پوشی ہے، جو سیرت محمدیؐ مسلمانوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

---

[۱] سورۂ بقرہ ۱۹۵

اقبالؔ درِ دولت پرؔ[1]

ڈاکٹر محمد اقبال کی پوری زندگی عشق رسول اور یاد مدینہ سے معمور تھی، ان کا زندہ جاوید کلام ان دونوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے، لیکن زندگی کے آخری ایام میں یہ پیمانۂ عشق اس طرح لبریز ہوا کہ مدینہ کا نام آتے ہی اشک محبت بے ساختہ جاری ہو جاتے، وہ اپنے اس کمزور جسم کے ساتھ یقیناً مدینۃ الرسول میں حاضر نہ ہو سکے لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل، نیز اپنی قوت تخیل اور زورِ کلام کے ساتھ انھوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور ان کا طائرِ فکر ہمیشہ اسی آشیانہ یا آستانہ پر منڈلاتا رہا۔

انھوں نے رسول اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اپنے دل، اپنی محبت، اپنے اخلاص اور اپنی وفا کی نذر پیش کی اور آپ کو مخاطب کرکے اپنے جذبات واحساسات، اپنی ملت اور اپنے معاشرہ کی دل گداز تصویر کھینچ کر رکھ دی، ایسے مواقع پر ان کے جوہر شاعری خوب کھلتے تھے، اور معانی کے سوتے پھوٹ پڑتے تھے، وہ حقائق جن کی زمام مضبوطی سے انھوں نے گرفت میں رکھی تھی، اس وقت بے حجاب وبے نقاب ہو کر سامنے آتے اور اپنا خوب رنگ دکھاتے۔

---

[1] یہ اُس عربی تقریر کا ترجمہ ہے جو "اقبال فی مدینۃ الرسول" کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں دمشق ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی تھی، ترجمہ مولوی محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے قلم سے ہے۔

بجز فے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوق حضوری طول دادم داستانے را

اس موضوع پر اُن کا کلام سب سے زیادہ جاندار، طاقتور، موثر ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی، ان کے تجربات کا نچوڑ، ان کے عہد کی تصویر اور ان کے نازک ترین احساسات کا آئینہ دار ہے۔

آگے ان کے جو اشعار پیش کئے جائیں گے ان میں انھوں نے عالم خیال میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کیا ہے اور اس تصور کے ساتھ، وہ قافلۂ شوق کے ساتھ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں، ذوق حضوری اور شوق ومحبت میں یہ ریت ان کو ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہو رہی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر ذرہ دل بن کر دھڑک رہا ہے، وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ ان دھڑکتے ہوئے دلوں کا خیال کرے اور نرم روی اختیار کرے۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است　　شبش کوتاہ و روزاو بلند است
قدم اے راہ رو آہستہ تر نہ　　چو ما ہر ذرۂ او دردمند است

حدی خواں کا نغمہ سن کر ان کی آتش شوق اور تیز ہونے لگتی ہے، دل کی جراحتیں تازہ ہو جاتی ہیں، ان کے پورے وجود میں حرارت اور زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے، اور ان کا سازِ دل درد و اثر میں ڈوبے ہوئے موثر اور بلیغ اشعار کے ساتھ نغمہ زن ہونے لگتا ہے۔

پھر وہ اسی عالم تصور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مواجہ شریف میں حاضر ہوتے ہیں، درود و سلام پڑھتے ہیں، محبت و شوق کی زبان ان کے دل کی ترجمان بن جاتی ہے، اور وہ اس مبارک و قیمتی ساعت سے فائدہ اٹھا کر اپنا حالِ دل بیان کرتے ہیں، اُمت اسلامیہ اور عالم اسلام کے حالات، اس کے مسائل اور مشکلات، اس کی آزمائشیں اور امتحانات نیز مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے اس کی سپر افگندگی اور بے بسی، اپنے وطن میں اس کی

غریب الوطنی اور خود اپنی قوم میں اپنے پیغام کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں، کبھی ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، اور کبھی دل کی بات زبان پر آجاتی ہے۔

اس مجموعۂ اشعار کا نام انھوں نے "ارمغان حجاز" رکھا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ پورے عالم اسلام کے لئے بہت مبارک تحفہ اور نسیم حجاز کا ایک مشکبار جھونکا ہے۔

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رُخ پہ کھُلی زلفِ یار ہے

اقبالؔ کا یہ روحانی سفر اس زمانہ میں ہوا جب اُن کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی، اور ان کے قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اس سن میں جب لوگ آرام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، اور گوشہ نشینی پسند کرتے ہیں، ان کو جس چیز نے اس طویل و پُر مشقت سفر پر آمادہ کیا اس کو فرمانِ محبت کی تعمیل اور مقصدِ زندگی کی تکمیل کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

بایں پیری رہ یثرب گرفتم — نوا خواں از سرور عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

وہ کہتے ہیں کہ اس وقت جب کہ میری زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے، اگر میں نے مدینہ منورہ کا (جو روح کا اصل مسکن اور مومن کا حقیقی نشیمن ہے) قصد کیا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے، جس طرح شام کے وقت چڑیاں اپنے اپنے آشیانہ کی طرف جاتی ہیں، اسی طرح میری روح بھی اب اپنے حقیقی آشیانہ کی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان جب ان کی اونٹنی اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے، تو وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ سوار بہت خستہ و بیمار ہے، لیکن ناقہ ان کے اس مشورہ کو قبول نہیں کرتا، وہ ایسا مستانہ وار قدم رکھتا ہے، گویا یہ ریگ زار نہیں بلکہ ریشم کا ایک فرش بچھا ہوا ہے۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو   کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی   بپائش ریگ ایں صحرا حریر است

اب یہ کاروانِ مدینہ درود و سلام کی سوغات لئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے، اس پُر کیف فضا میں وہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کو اس گرم ریت پر ایک ایسا سجدہ میسر ہو جو ان کی پیشانی کے لئے نقشِ دوام بن جائے، وہ اپنے دوستوں کو بھی اسی سجدۂ شوق کا مشورہ دیتے ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ در وے کاروانہا   درودے خواند و محمل براند
بہ ریگ گرم او آور سجودے   جبیں را سوز تا داغے بماند

ذوق و شوق کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے تو عراقیؔ اور جامیؔ کے اشعار بے ساختہ اُن کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، لوگ حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں، کہ یہ عجمی آخر کس زبان میں اشعار پڑھ رہا ہے، جو سمجھ میں تو نہیں آتے لیکن دل کو درد و محبت سے اس طرح بھر دیتے ہیں کہ آدمی کو کھانے پینے کا بھی ہوش باقی نہیں رہتا اور پانی کے بغیر بھی اس کی تشنگی دُور اور خستگی کافور ہو جاتی ہے۔

امیر کارواں آں اعجمی کیست   سرود او بآہنگ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابی او   خنک دل در بیابانے تواں زیست

راستہ کی دشواریوں اور مشقتوں میں ان کو لطف آنے لگتا ہے، شب بیداری، کم خوابی اور بے آرامی سے سرور حاصل ہوتا ہے، وہ اس راستہ کو طویل نہیں سمجھتے اور جلد پہونچنے کی آرزو نہیں کرتے بلکہ اپنے ساربان سے اس کی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس سے بھی زیادہ دور و دراز راستہ سے لے چلے تاکہ اس بہانہ سے ذوق و شوق کی مدت بھی کچھ دراز ہو سکے اور انتظار کا لطف (جو عشاق کا زادِ سفر اور محبین کا سرورِ نظر سمجھا گیا ہے) دوبالا ہو سکے۔

غم راہی نشاط آمیز تر کن   فغانش را جنوں انگیز تر کن

بگیر اے ساربان راہِ درازے　　　مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

اسی سرور و شوق اور کیف و مستی کے ساتھ وہ سارا راستہ طے کرتے ہوئے مدینہ طیبہ پہونچتے ہیں، اور اپنے رفیقِ سفر سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی زلف کے اسیر ہیں، آج ہم کو اپنے دل کی مراد بر لانے اور اپنے آقا اور محبوب کے قدموں پر اپنی پلکیں بچھانے کا موقع ملا ہے، اس لئے آج ہمیں اپنی آنکھوں پر سے پابندی ہٹا لینی چاہیئے، اور اس سیلاب اشک کو جو عرصہ سے اُمنڈنے کے لئے بے چین ہے، تھوڑی دیر کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم　　　من و تو کشتۂ شانِ جمالیم

دو حرفے بر مرادِ دل بگوئم　　　بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

وہ اپنے اوپر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا خوش نصیبی اور مقامِ مسرت ہے کہ یہ سعادت اور نعمت ان کے نصیب میں آئی اور اس گدا کو اپنی نا اہلی کے باوجود اس دربار شاہی میں نوازا گیا جہاں بڑے بڑے دانشوروں اور اورنگ نشینوں کو توفیق باریابی حاصل نہ ہو سکی۔

حکیماں را بہا کمتر نہادند　　　بناداں جلوۂ مستانہ دادند

چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے　　　درِ سلطاں بہ درویشے کشادند

لیکن اس سرور و مستی اور جذب و شوق میں بھی وہ اُمت مسلمہ اور ملت اسلامی ہند کو فراموش نہیں کرتے اور پوری صدق بیانی اور قادر الکلامی کے ساتھ اس کا دردِ دل کتاب کی طرح کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

مسلماں آں فقیر کج کلاہے　　　رمید از سینۂ او سوز آہے

دلش نالد چرا نالد نداند　　　نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

وہ کہتے ہیں کہ اس اُمت کی بڑی آزمائش یہ ہے کہ یہ بام بلند سے گری ہے، اور جو جتنے

اوپر سے گرتا ہے، اتنی ہی اس کو چوٹ آتی ہے۔

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے　　مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا　　کہ افتاد است از بام بلندے

وہ کہتے ہیں کہ اس اُمت کی پریشان روزگاری اور اس کی بے نظمی و بدحالی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت ہے اور امام نہیں، افراد ہیں اور نظام نہیں۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است　　ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کار بے نظام او چہ گویم　　تو می دانی کہ ملت بے امام است

وہ کہتے ہیں کہ اس کے خون میں اب وہ "تب و تاب" اور اس کے اندر وہ مردم خیزی کی صلاحیت باقی نہیں رہی جو اس کا طرۂ امتیاز تھا، اب عرصہ سے اس کی نیام بے شمشیر اور اس کی "کشت ویران" لالہ و گل سے محروم ہے۔

نماند آں تاب و تب در خون نابش　　نروید لالہ از کشت خرابش
نیام او تہی چوں کیسۂ او　　بطاق خانۂ ویراں کتابش

وہ کہتے ہیں کہ یہ اُمت اپنے سرمایۂ آرزو اور ذوق جستجو سے محروم ہوکر رنگ و بو میں گرفتار ہوگئی ہے، اس کے کان نرم و نازک نغموں کے خوگر ہوگئے ہیں، اور مردانِ حُر کی آواز اس کے لئے نامانوس ہو چکی ہے

دلِ خود را اسیرِ رنگ و بو کرد　　تہی از ذوق و شوق آرزو کرد
صفیر شاہبازاں کم شناسد　　کہ گوشش باطنین پشہ خو کرد

اب نہ وہ اس کی آنکھ میں یقین کا نور اور عشق کا سرور ہے، نہ اس کا دل کسی کی محبت میں مخمور اور اس کا سینہ کسی کی یاد سے معمور ہے، وہ حضوری سے بہت دُور اور منزلِ مقصود سے ناآشنا اور مہجور ہے۔

بچشم او نہ نور و نے سرور است　　نہ دل در سینۂ او ناصبور است

خدا ایں امتے را یار بادا   کہ مرگِ او زجانِ بے حضور است

پھر وہ اس کے شاندار ماضی کا موازنہ (جب اس پر لطف وعنایت کی نظرِ خاص تھی) اس داغ دار حال سے کرتے ہیں، وہ بڑی بلاغت اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہتے ہیں کہ جس کو آپ نے پھلوں اور میووں پر پالا ہوا اور ناز ونعم میں رکھا ہو وہ آج ان صحراؤں میں اپنا رزق تلاش کرنے اور دربدر بھٹکنے پر مجبور ہے۔

مپرس از من کہ احوالش چناں است   زمینش بدگہر چوں آسمان است

برآں مرغے کہ پروردی بانجیر   تلاشِ دانہ در صحرا گران است

وہ لادینیت کے اس طوفان بلاخیز کا ذکر کرتے ہیں جو عالم اسلام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے، ڈاکٹر محمد اقبال (جو خود فلسفہ سیاسیات اور اقتصادیات کے غواص تھے اور اس کا کوچہ کوچہ ان کا دیکھا ہوا تھا) اچھی طرح سمجھتے تھے کہ عالم اسلام میں لادینیت کا سب سے بڑا راستہ "خالص مادہ" پرستانہ نقطۂ نظر" روحانی خلا" اور "قلب کی برودت" ہے، مسرفانہ اور امیرانہ زندگی سے اس میں اور مدد مل رہی ہے، وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ لادینیت کے اس سیلاب اور مادہ پرستانہ معاشی فلسفہ کا مقابلہ اگر کسی چیز سے ہو سکتا ہے، تو وہ زہد اور محبت ہے، اس پر اگر کوئی چیز غالب آسکتی ہے تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زاہدانہ اور عاشقانہ زندگی ہے، وہ مسلمانوں کے لئے اس مثالی زندگی کی آرزو کرتے ہیں جو زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہو وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایسی زندگی وجود میں آجائے تو ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکانے اور اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوگی۔

دگرگوں کرد لادینی جہاں را   ز آثار بدن گفتند جاں را

ازاں فقرے کہ با صدیق دادی   بشورے آور ایں آسودہ جاں را

وہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب فقر وافلاس اور مادی وسائل کی کمی کو نہیں سمجھتے ہیں بلکہ اس کی توجیہ اس "شعلہ زندگی" کی افسردگی سے کرتے ہیں، جو کسی عہد میں ان کے سینہ کے اندر فروزاں تھا۔

وہ کہتے ہیں جب یہ درویش اور فقیر ایک اللہ کے لئے سجدہ ریز تھے، اور کسی اور کا اقتدار اور اختیار تسلیم نہیں کرتے تھے، اس وقت شہنشاہوں کا گریبان ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن جب یہ شعلہ سرد ہو گیا تو ان کو درگاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لینی پڑی۔

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند　　گریباں شہنشاہاں دریدند
چو آں آتش درون سینہ افسرد　　مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

وہ مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں، اور اس کا ایک ایک ورق اُلٹ کر دیکھتے ہیں، اس میں ان کو جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں، جن سے ایک مسلمان کا سر شرم و ندامت سے جھک جائے، بہت سی ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جن کو نبوت محمدی، اس کی تعلیمات اور اس کی اعلیٰ قدروں اور اصولوں سے کوئی مناسبت نہیں، ان کو بہت سی مشرکانہ باتیں، غیر اللہ کی پرستش، جابر و ظالم بادشاہوں اور حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی مدح سرائی کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جن سے ایک غیور اور خوددار انسان کی پیشانی عرق آلود ہونے لگتی ہے، اقبال خاموشی کے ساتھ ایک ایک چیز دیکھتے جاتے ہیں، اور آخر میں بڑی صراحت اور اعتراف کے ساتھ لیکن بڑی بلاغت اور اختصار کے ساتھ کہتے ہیں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان پستیوں کے ساتھ ہم ہرگز آپ کے شایان شان نہ تھے، ہمارا انتساب آپ کی طرف آپ کی شان میں کھلی بے ادبی ہے۔

ننالم از کسے می نالم از خویش
کہ ما شایان شانِ تو نبودیم

وہ عالم اسلام پر جو ان کا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا ہے، احتیاطاً دوبارہ ایک نظر ڈالتے ہیں، اور اپنے جائزہ کا حاصل یہ بتاتے ہیں کہ ایک طرف خانقاہوں کا سبو خالی ہے، دوسری طرف دانش گاہیں جدت و جرأت سے عاری ہیں، ان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ طے کئے ہوئے سفر کو

بار بار طے کرتی رہیں، ادب و شاعری مردہ و بے روح اور دلی جذبات سے محروم ہیں۔

سبوئے خانقاہاں خالی از مے — کند مکتب رہِ طے کردہ را طے
ز بزم شاعراں افسردہ رفتم — نواہا مردہ بیروں افتد از نے

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دنیائے اسلام کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ مسلمان مجھے نہ ملا جو موت سے لرزہ براندام ہونے کے بجائے موت اس سے لرزہ براندام ہو اور جو خود موت کے لئے پیام موت ہو

بآں بالے کہ بخشیدی پریدم — بسوز نغمہائے خود تپیدم
مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد — جہاں گردیدم و او را ندیدم

وہ مسلمانوں کی پریشاں خاطری، آشفتہ سری اور آوارہ گردی کا راز فاش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر وہ فرد یا جماعت جو دل تو رکھتی ہے لیکن دلبر نہیں رکھتی ہے، محبت رکھتی ہے، لیکن محبوب سے نا آشنا ہے، وہ دلجمعی اور اطمینان سے ہمیشہ محروم رہتی ہے، اس کی تمام قوتیں ضائع ہوتی ہیں، اور اس کی جدوجہد کبھی ایک منزل اور ایک مرکز پر قائم نہیں رہتی۔

شبے پیش خدا بگریستم زار — مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

لیکن ان تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود وہ مسلمانوں سے بددل اور خدا کی رحمت سے مایوس نہیں، بلکہ اس مایوسی، دوسروں پر اعتماد کرنے اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی تلقین کرنے والوں پر سخت تنقید کرتے ہیں اور بڑے درد سے کہتے ہیں کہ حرم کے نگہبان بتخانہ کے پاسبان بن بیٹھے ہیں، ان کا یقین مردہ و مضمحل اور ان کی نگاہ بھی مستعار اور رہین منتِ اغیار ہے۔

نگہبانِ حرم معمار دیر است — یقینش مردہ و چشمش بغیر است
ز انداز نگاہ او تواں دید — کہ نومید از ہمہ اسباب خیر است

وہ کہتے ہیں کہ مسلمان اگرچہ بے خیل وسپاہ ہیں، لیکن ان کا ظرف بادشاہوں سے زیادہ عالی اور نگاہ سلاطین سے زیادہ بلند ہے، اگر تھوڑی دیر کے لئے ان کو ان کا مقام دے دیا جائے تو ان کا یہ جمال جہاں افروز، جلال عالم سوز کا منظر بھی پیش کر سکتا ہے۔

مسلماں گرچہ بے خیل وسپاہے است　　ضمیر او ضمیر بادشاہے است
اگر اورا مقامش باز بخشند　　جمال او جلال بے پناہے است

وہ اپنا اور اس عصر کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ برسرپیکار ہیں، اور جو قدم قدم پر ان کے لئے ایک مستقل آزمائش اور امتحان ہے۔

گہے رفتم گہے مستانہ خیزم　　چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہ التفاتے بر سرِ بام　　کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال کی پوری زندگی عصر جدید سے کشمکش میں گزری، انھوں نے مغربی تہذیب اور مادی فلسفہ کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس پر آگے بڑھ کر سخت تنقید کی، اس کو چیلنج کیا، اور بڑی جرأت، روشن ضمیری اور گہرائی کے ساتھ اس کو کھوٹا ثابت کیا اور اس پردۂ فریب کو چاک کیا جس نے اس کی اصلی اور مکروہ شکل کو نگاہوں سے چھپا رکھا تھا، وہ حقیقت میں نئی نسل کے مربّی، یقین وخود اعتمادی، نیز اپنی اور اسلامی شخصیت کے مکمل شعور کے حامل اور مادی بنیادوں اور مادی طرزِ فکر کے زبردست منکر تھے، اور ان کو یہ کہنے کا حق حاصل تھا۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من　　ازو آموختم اسرارِ جاں من
بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او　　بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

وہ مغربی علوم سے اپنی بغاوت، اس کے جال سے بچ نکلنے اور اپنے عقیدہ وایمان اور خصوصیات کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے بڑا قلندرانہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے مغربی فلسفہ وتہذیب کے

آتش نمرود میں شانِ ابراہیمی کا مظاہرہ کیا، وہ فخر و مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان علوم کے مغز کو حاصل کر لیا پوست کو پھینک دیا اور یہی نہیں بلکہ کامیابی کے ساتھ اس کے جال سے باہر بھی آگئے اور اس کے طلسم ہوشربا کو پاش پاش کردیا جس نے مشرق و مغرب دونوں کی نظر بندی کر رکھی ہے۔

طلسمِ علم حاضر را شکستم　　ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم　　بہ نارا وچہ بے پروا نشستم

وہ اپنی اس زندگی کا ذکر کرتے ہیں جو یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں گزری تھی اور جہاں خشک و افسردہ کتابوں، دقیق فلسفیانہ مباحث، جمال فتنہ انگیز اور دل آویز و خوشنما مناظر کے سوا انھیں اور کچھ نہ مل سکا، اگر کوئی چیز ملی تو وہ خود فراموشی تھی، جس نے ان کو ان کے وجود سے بھی محروم کردینا چاہا۔

بہ افرنگی بتاں دل باختم من　　زتاب دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتن بیگانہ بودم　　چو دیدم خویش را نشناختم من

اب بھی جب ان کو ان دلوں کی ویرانی و بے نوری یاد آتی ہے ان کی طبیعت پر وحشت و انقباض طاری ہوجاتا ہے۔

وہ بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں کہ میخانۂ مغرب میں بیٹھ کر مجھے سوائے دردِ سر کے اور کچھ نہ ملا، اس سے زیادہ بے سوز بے نور اور بے کیف شب و روز مجھے اپنی پوری عمر میں یاد نہیں جو ان دانشمندانِ فرنگ کے ساتھ گزرے

مے از میخانۂ مغرب چشیدم　　بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم بانکویانِ فرنگی　　ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

پھر بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں میں تو آپ کے ایک فیض نگاہ کا پروردہ ہوں "اہل دانش" اور "اہل خرد" کی یہ ساری نکتہ آفرینیاں اور لن ترانیاں میرے لئے دردِ سر کا سامان اور وبالِ جان ہیں، میں تو صرف آپ کے در کا فقیر ہوں، آپ کی گلی کا سائل ہوں، مجھے کسی کے سنگ آستاں پر سر پھوڑنے

اور قسمت آزمانے کی کیا ضرورت؟

فقیرم از تو خواہم ہر چہ خواہم　　دل کوہے خراش از برگ کاہم
مرادرس حکیماں درد سرداد　　کہ من پروردۂ فیض نگاہم

پھر وہ اس طبقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو علم دین کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے، وہ اس کی خشکی جمود، محبت اور سوز دروں سے محرومی، معلومات کی گرم بازاری اور اصطلاحات کی گراں باری کا شکوہ کرتے ہوئے بڑے شاعرانہ اور بلیغ انداز میں کہتے ہیں کہ اس کا صحرائے حجاز زمزم سے خالی اور بیت اللہ سے محروم ہے، وہ کہتے ہیں کہ حجاز کے ریگستان کی قیمت تو بیت اللہ اور آبِ زمزم سے ہے اگر یہ نہ ہوں تو ان تپتے ہوئے بیابانوں اور خاموش پہاڑوں سے کیا فائدہ؟ اسی طرح وہ عالمِ دین کتنا مفلس اور نادار ہے، جو علم وافر، زبان گہر افشاں اور ذہن رسا کا مالک ہے لیکن اس کی آنکھ محبت کے ایک آنسو اور دل کی ایک تڑپ سے بھی ناآشنا ہے جس کے حصہ میں اس سرزمین مقدس کی صرف سختی اور گرمی آئی ہے خنکی اور نمی نہیں آئی۔

دلِ ملا گرفتارِ غمے نیست　　نگاہے ہست در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتب او　　کہ در ریگ حجازش زمزمے نیست

وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار غیر اللہ پر بھروسہ کیا اور اس کی سزا میں دو سو بار اپنے مقام سے نیچے گرایا گیا، یہ وہ جگہ ہے جہاں زورِ شمشیر اور حسنِ تدبیر کام نہیں آتا، یہ تقدیر الٰہی اور مشیت ایزدی کا مقام ہے، اور اس میں ایک لغزش قدم آدمی کو بہت نیچے گرا سکتی ہے۔

دلِ خود را بدستِ کس ندادم　　گرہ از روئے کار خود کشادم
بغیر اللہ کردم تکیہ یک بار　　دو صد بار از مقامِ خود فتادم

وہ کہتے ہیں کہ اس بے اخلاص و بے سوز عہد میں جو منفعت و مصلحت کے سوا کسی اور چیز سے

آشنا نہیں، اور حس کا مصنوعی یا حیوانی دل ہر قسم کے لطیف احساسات اور مخلصانہ جذبات سے عاری ہے، میرے لئے سوز دروں کی آگ میں جلنے اور خونِ جگر پینے کے سوا اور کیا ہے۔

نگاہم زانچہ بینم بے نیاز است   دل از سوزِ درونم در گداز است
من و ایں عصر بے اخلاص و بے سوز   بگو با من کہ آخر ایں چہ راز است

وہ کہتے ہیں مشرق و مغرب کسی جگہ میرا کوئی ہمدم و ہمراز نہیں، میں اپنا غمِ دل خود اپنے ہی دل سے کہتا ہوں اور اپنے کو بہلاتا ہوں۔

من اندر مشرق و مغرب غریبم   کہ از یاران محرم بے نصیبم
غمِ خود را بگویم با دلِ خویش   چہ معصومانہ غربت را فریبم

اُن کو اس کی شکایت ہے کہ ان کی مخلصانہ نصیحتوں اور مشوروں پر کسی نے عمل نہیں کیا اور ان کے نخلِ علم کا کسی نے پھل نہ کھایا، انھوں نے شاعری میں جس سروش غیب کی ترجمانی کی اس پر کسی نے کان نہ دھرا، سب ان کو ترجمانِ حقیقت کے بجائے محض غزل خواں اور غزل گو سمجھتے رہے۔

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند   زشاخِ نخل من خرما نخوردند
من اے میر امم داد از تو خواہم   مرا یاراں غزل خوانے شمردند

وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کرتے ہیں کہ آپ کا حکم اور فرمان تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو زندگی اور بقاء دوام کا پیغام پہونچاؤں، لیکن یہ ناحق شناس مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ عام اور پیشہ ور شعراء کی طرح میں لوگوں کی تاریخ وفات نکالتا اور قطعۂ تاریخ کہتا رہوں۔

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئے   بگوش مردۂ پیغام جاں گوئے
ولے گویند ایں ناحق شناساں   کہ تاریخِ وفات ایں و آں گوئے

وہ بڑے درد و سوز اور بڑی حسرت اور تلخی کے ساتھ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ

وہ علم اور وہ پیغام جو ان کے اشعار کی روح اور اصل قیمت ہے اس سے لوگوں کو سب سے کم دل چسپی ہے اور اس میں انھوں نے بڑی قناعت اور زہد کا ثبوت دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اپنی ساری متاع کھول کر میں نے بازار میں رکھ دی لیکن کوئی اس جنس نایاب کا خریدار نہ ملا، میں نے ارمغانِ دل پیش کرنا چاہا لیکن اس کا بھی کوئی قدر دان نظر نہ آیا، مجھ سے زیادہ غریب الوطن، بیگانہ اور تنہا اس دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے۔

متاعے داشتم غارت گرے نیست | دلے بر کف نہادم، دلبرے نیست
مسلمانے زمن تنہا ترے نیست | درونِ سینۂ من منزلے گیر

آخر میں وہ سلطان ابن سعود کو خطاب کرتے ہیں، لیکن ان کا روئے سخن دراصل تمام عرب بادشاہوں اور عالمِ اسلام کے سربراہوں کی طرف ہے اس میں انھوں نے غیر ملکیوں پر اعتماد کے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور ان کے بجائے خدا پر اور اس کے بعد خود اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر طناب تمہاری ہے تو جہاں چاہو اور جس وقت چاہو اپنا خیمہ گاڑ سکتے ہو اور ہر جگہ منزل بنا سکتے ہو اور اگر وہ نہیں تو پھر مستعار لے کر تم آزادی کے ساتھ کوئی قدم نہیں بڑھا سکتے۔

وہ کہتے ہیں کہ ذرا اپنے کو پہچاننے کی کوشش کرو، اس روئے زمین میں تم کو وہ مقام حاصل ہے جس کی شام دوسروں کی سحر سے زیادہ آئینہ فام ہے۔

کہ شامش چوں سحر آئینہ فام است | ترا اندر بیابانے مقام است
طناب از دیگراں جستن حرام است | بہر جائے کہ خواہی خیمہ گستر

حضور و سرور

نظر اٹھا کر دیکھئے، یہ دونوں طرف پہاڑوں کی قطاریں ہیں، کیا عجب ہے کہ ناقۂ نبوی اسی راستہ سے گزرا ہو، یہ فضا کی دلکشی، یہ ہوا کی مشک بیزی اسی وجہ سے ہے ؎

الا ان وادی الجزع اضحیٰ ترابہ من المسک کافوراً واعوادہ رندا

وماذا لک الا ان ھند اعشیۃ تمشت وجرّت فی جوانبہ بُردا

لیجئے، مسجد[1] آگئی، اب بیر علی (ذوالحلیفہ) کی باری ہے ؎

منزل دوست چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد!

درود شریف زبان پر جاری ہے، دل وفور شوق سے اُمنڈ رہا ہے، عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے، اور کیوں روتا ہے، کبھی عربی میں گنگناتا ہے، کبھی دوسری زبانوں میں شعر پڑھتا ہے۔

بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی، جس قدر طیبہ قریب ہوتا جا رہا ہے، ہوا کی خنکی، پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک، لیکن دل کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے، سنئے کوئی کہہ رہا ہے۔

---

[1] مدینہ کے راستہ میں ایک منزل کا نام ہے۔

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے — شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے
وہ ایک بار ادھر سے گئے گرابِ تک — ہوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے
عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں — کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سُبُل ختم الرُّسل مولائے کل جس نے — غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است — اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است
داغ غلامیت کرد رتبۂ خسرو بلند — میر ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید
محمدؐ عربی کابروے ہر دو سرا است — کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سراو

لیجئے ذوالحلیفہ آگیا، رات کا بقیہ حصہ یہاں گزارنا ہے، غسل کیا، خوشبو لگائی، کچھ دیر دم لے لیجئے اور کمر سیدھی کر لیجئے، صبح ہوئی نماز پڑھی، موٹر روانہ ہوئی، کیا جہاں سر کے بل آنا چاہیئے تھا، وہاں موٹر پر سوار ہو کر جائیں گے؟ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنا کام آیا، "وادی عقیق" میں "بیر عروہ" کے پاس اتار دے گا، سامان مستورات اور ضعفا سوار رہیں گے، بات کرتے کرتے بیر عروہ آگیا، بسم اللہ اُتریئے، وہ دیکھئے جبل احد نظر آرہا ہے، "ذالك جبل يحبنا ونحبه" وہ سواد مدینہ کے درخت نظر آئے، کیا وہی درخت ہیں جن کے متعلق شہیدی مرحوم نے کہا تھا۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

وہ گنبدِ خضرا نظر آیا، دل کو سنبھالئے اور قدم اٹھایئے، یہ لیجئے مدینہ میں داخل ہوئے، مسجد نبویؐ کی دیوار کے نیچے نیچے بابِ مجیدی سے گزرتے ہوئے، بابِ جبریل پر جاکر رکے، حاضری کے شکرانہ میں کچھ صدقہ کیا اور اندر داخل ہوئے، پہلے محرابِ نبویؐ میں جاکر دوگانہ ادا کیا، گنہگار آنکھوں کو جگر کے پانی سے غسل صحت دیا، وضو کرایا پھر بارگاہ نبویؐ پر حاضر ہوئے۔

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ
يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلَيْكَ يَا حَبِيْبَ اللّٰهِ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلَيْكَ يَا صَاحِبَ الْخُلُقِ الْعَظِيْمِ اَلصَّلٰوۃُ
وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَافِعَ لِوَاءِ الْحَمْدِ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ
يَا صَاحِبَ الْمَقَامِ الْمَحْمُوْدِ اَلصَّلٰوۃُ
وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُخْرِجَ النَّاسِ
بِاِذْنِ اللّٰهِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ
اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُخْرِجَ
النَّاسِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ اِلٰى
عِبَادَةِ اللّٰهِ وَحْدَهٗ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلَيْكَ يَا مُخْرِجَ النَّاسِ مِنْ جَوْرِ الْاَدْيَانِ
اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَامِ وَمِنْ ضِيْقِ
الدُّنْيَا اِلٰى سَعَةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ،
اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا صَاحِبَ
النِّعْمَةِ الْجَسِيْمَةِ، اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلَيْكَ يَا صَاحِبَ الْمِنَّةِ الْعَظِيْمَةِ، اَلصَّلٰوۃُ

آپ پر صلوٰۃ و سلام اے اللہ کے
رسول، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے اللہ
کے نبی، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے اللہ
کے حبیب، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے
صاحب خلق عظیم، آپ پر صلوٰۃ و
سلام اے قیامت کے دن لواء الحمد
بلند کرنے والے، آپ پر صلوٰۃ و سلام
اے صاحب مقام محمود، آپ پر صلوٰۃ و
سلام اے اللہ کے حکم سے لوگوں کو تاریکیوں
سے روشنی میں نکال کر لانے والے آپ پر
صلوٰۃ و سلام اے لوگوں کو بندوں کی
بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل
کرنے والے آپ پر صلوٰۃ و سلام اے لوگوں کو
مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے
عدل و انصاف میں داخل کرنے والے اور
دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعت
میں پہونچانے والے، آپ پر صلوٰۃ و سلام اے
انسانیت کے سب سے بڑے محسن اے انسانوں پر
سب سے بڑھ کر شفیق، اے وہ جس کا اللہ کی

وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَمِيْنَ خَلْقِ اللّٰهِ
عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا
اللّٰهُ وَحْدَهٗ وَأَنَّكَ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ
قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَأَدَّيْتَ الْأَمَانَةَ
وَنَصَحْتَ الْأُمَّةَ وَجَاهَدْتَ فِي اللّٰهِ
حَقَّ جِهَادِهٖ وَعَبَدْتَ اللّٰهَ حَتّٰى
أَتَاكَ الْيَقِيْنُ فَجَزَاكَ اللّٰهُ عَنْ هٰذِهِ
الْأُمَّةِ خَيْرَ مَا جَزٰى نَبِيًّا عَنْ أُمَّتِهٖ
وَرَسُوْلًا عَنْ خَلْقِهٖ اَللّٰهُمَّ آتِ
محمدن الوسيلة والفضيلة وَابْعَثْهُ
مَقَامًا مَّحْمُوْدَانِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ إِنَّكَ
لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ
وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ
وَعَلٰى آلِ ابراهيم إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى ابراهيم وعلى آل
ابراهيم انك حميد مجيد۔[1]

مخلوق پر اللہ کے بعد سب سے بڑا احسان
ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا
کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ آپ اللہ
کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں، آپ نے اللہ
کا پیغام پوری طرح پہونچا دیا، امانت کا حق
ادا کر دیا، امت کی خیر خواہی میں کسر نہیں رکھی
اللہ کے راستہ میں پوری پوری کوشش کی اور
وفات تک اللہ کی عبادت میں مشغول رہے،
اللہ آپ کو اس امت اور اپنی مخلوق کی طرف
سے وہ بہترین جزا دے جو کسی نبی و رسول کو اس کی
امت اور اللہ کی مخلوق کی طرف سے ملی ہو،
اے اللہ تو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو قرب و
بلندی اور وہ مقام محمود عطا کر جس کا تو نے
ان سے وعدہ فرمایا ہے تو اپنے وعدہ کے خلاف
نہیں کرتا، اے اللہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پر اور
ان کی آل پر اپنی رحمتیں نازل فرما جیسی تو نے
ابراہیم (علیہ السلام) اور آل ابراہیم پر نازل فرمائیں
بے شک تو حمید و مجید ہے، اے اللہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم)
اور آل محمد پر برکتیں نازل فرما جیسی تو نے ابراہیم و

[1] یہ درود مصنف کی زبان سے پہلی حاضری میں نکلا، یہ کسی کتاب سے منقول نہیں ہے۔

آلِ ابراہیم پر نازل فرمائیں بے شک تو

حمید و مجید ہے۔

اس کے بعد دونوں رفیقوں اور وزیروں کو محبت کا خراج اور عقیدت کا نذرانہ سلام و دعا کی شکل میں پیش کیا اور قیام گاہ پر آئے۔

اب آپ ہیں اور مسجد نبویؐ، دل کا کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے، درود شریف پڑھنے کا اس سے بہتر زمانہ اور اس سے بہتر مقام کون ہو سکتا ہے اب بھی شہود و حضور نہ ہو تو کب ہوگا جنت کی کیاری "رَوْضَۃٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ" میں نمازیں پڑھئے، مگر دیکھئے کسی کو تکلیف نہ دیجئے، مزاحمت جگہ کو اپنے لئے محفوظ کرنا، مسجد میں دوڑنا سب جگہ بُرا ہے، مگر جہاں سے یہ احکام نکلے اور دنیا میں پھیلے وہاں ان کی خلاف ورزی بہت ہی مکروہ ہے، یہاں آواز بلند نہ ہو "اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ" یہاں دنیا کی باتیں نہ ہوں، مسجد کو گزرگاہ نہ بنایا جائے، بے وضو داخل ہونے سے حتی الامکان احتراز کیا جائے، خرید و فروخت سے اجتناب کیا جائے۔

دن میں جتنے مرتبہ جی چاہے حاضری دیجئے اور سلام عرض کیجئے، آپ کے نصیب کھل گئے اب کیوں کمی کیجئے، مگر ہر بار عظمت و ادب اور اشتیاق و محبت کے ساتھ، دل کی ایک حالت نہیں رہتی، وہ کبھی سوتا اور جاگتا ہے، جاگے تو سمجھئے کہ نصیب جاگے، حاضری دیجئے اور عرض کیجئے۔ ؏

ز چشمم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

کبھی اس کا جی چاہے گا کہ غلاموں کے وفود کے ساتھ ملا جلا حاضر ہو، عشاق کی آنکھوں سے جنھوں نے مہجوری کے دن کاٹے اور فراق کی راتیں بسر کیں، جب آنسوؤں کا مینہ برسے گا تو شاید کوئی چھینٹا اس کو بھی تر کر جائے، رحمت کی ہوا جب چلے گی تو شاید کوئی جھونکا اس کو بھی

لگ جائے، کبھی دبے پاؤں لوگوں کی نظر بچا کر تنہائی میں حاضر ہونے کا جی چاہے گا، اس باب میں دل کی فرمائشیں سب پوری کیجئے، کوئی حسرت باقی نہ رہے، کبھی صرف آنسوؤں سے زبان کا کام لیجئے، کبھی ذوق و شوق کی زبان میں عرض کیجئے، درود شریف طویل بھی ہیں، اور مختصر بھی جس میں جی لگے اور ذوق پیدا ہو اس کو اختیار کیجئے، مگر اتنا خیال رکھئے کہ توحید کے حدود سے قدم باہر نہ جائے، آپ اس کے سامنے کھڑے ہیں جس کو "ماشاء اللہ وشئت" اور "مَنْ یَّعْصِہِمَا" سننا گوارا نہ ہو سکا[1] سجدہ کا کیا ذکر؟[2] خدا کی صفات میں اس کی قدرت و تصرف میں، اس کی مشیئت و اختیار میں شرکت کا شائبہ بھی نہ آنے پائے، چاہے جامی کا کلام پڑھئے، چاہے حالی کی دعا سنائیے، بس اتنا خیال رکھئے کہ آپ توحید کے سب سے بڑے اور آخری پیغمبر کے سامنے کھڑے ہیں جس کو شرک کا واہمہ بھی گوارا نہ تھا

اب ہم مدینہ منورہ میں مقیم ہیں جہاں کی خاکروبی کو اولیاء و سلاطین سعادت سمجھتے تھے، وہاں آپ ہر وقت حاضر ہیں، ایک ایک دن اور ایک ایک گھڑی کو غنیمت سمجھئے، پانچوں نمازیں مسجد نبوی میں جماعت کے ساتھ پڑھئے، اگر کہیں باہر جائیے بھی تو ایسے وقت کہ کوئی جماعت فوت نہ ہو، تہجد

---

[1] حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے کہا "ماشاء اللہ وشئت" (جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں) آپ نے ارشاد فرمایا، "اَجَعَلْتَنِی لِلّٰہِ نِدًّا" (کیا تم نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا) "ماشاء اللہ وحدہٗ" جو اللہ ہی چاہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا "من یطع اللہ ورسولہٗ فقد رَشَدَ و مَنْ یَّعْصِہِمَا فقد غوٰی" (جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے راہِ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہوا) حضورؐ نے اس کو ناپسند کیا کہ اللہ تعالیٰ کا اور آپ کا ذکر اس طرح ایک لفظ میں کیا جائے جس سے دونوں کی برابری محسوس ہو، آپ نے فرمایا "بئس خطیب القوم انت" تم بہت بُرے مقرر ہوئے۔

[2] حضورؐ نے حضرت قیس بن سعد صحابی سے فرمایا: بھلا تم اگر میری قبر کے پاس سے گزرو تو سجدہ کرو گے؟ قیس نے کہا نہیں، فرمایا تو پھر مجھے (زندگی میں) بھی نہ کرو۔ (ابو داؤد کتاب النکاح)

میں حاضر ہوئیے، یہ وقت سکون کا ہوتا ہے، لوگ روضۂ جنت کی طرف دوڑتے ہیں، وہاں تو بغیر دوڑے اور بغیر کشمکش جگہ پانی مشکل ہے، آپ پہلے مواجہہ (شریف) میں آئیے اس وقت شاید آپ کو صرف پہرہ دار (عسکری) ہی ملے، اطمینان سے سلام عرض کیجئے پھر جہاں جگہ ملے نوافل پڑھئے اور صبح کی نماز پڑھ کر اشراق سے فارغ ہو کر باہر آئیے۔

آئیے آج بقیع چلیں جو انبیاء علیہم السلام کے مقابر کے بعد صدق و اخلاص کا سب سے بڑا مدفن ہے۔

دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اگر آپ کی سیرت نبویؐ، صحابہ کرامؓ کے احوال و مراتب پر نظر ہے تو آپ کو وہاں صحیح احساس ہوگا، آپ ہر قدم پر رکیں گے اور ایک ایک خاک کے ڈھیر کو اپنے آنسوؤں سے سیراب کرنا چاہیں گے یہاں چپہ چپہ پر ایمان و جہاد اور عشق و محبت کی تاریخ کندہ ہے، ایک ایک ڈھیر میں اسلام کا خزانہ دفن ہے، اب بقیع میں داخل ہو گئے، ضرور آپ کو سیدھا اہل بیت اطہار کے مقابر پر لے جائے گا، یہاں عم رسولؐ سیدنا عباس بن عبدالمطلب، سیدۃ نساء اہل الجنۃ فاطمہؓ بنت الرسول، سیدنا حسنؓ بن علیؓ، سیدنا علی بن الحسین زین العابدین، سیدنا محمد الباقرؒ، سیدنا جعفر الصادقؒ آرام فرما ہیں، وہاں سے چلتے وقت حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور (حضرت خدیجہ و میمونہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ) تمام ازواج مطہرات، پھر بنات طاہرات کے مقابر ملیں گے، پھر دار عقیل بن ابی طالب جہاں ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب و عبداللہ بن جعفر وغیرہ مدفون ہیں، پھر آپ کو ایک ٹکڑا ملے گا جس میں امام دارالہجرۃ سیدنا مالک بن انس صاحب المذہب اور ان کے استاد نافع آرام فرما ہیں، وہاں سے بڑھئے تو ایک بقعۂ انوار ملے گا، یہ ایک مہاجر کا پہلا مدفن ہے یہاں وہ عثمان بن مظعون دفن ہیں، جن کی پیشانی کو حضورؐ نے بوسہ دیا تھا، یہیں فرزند رسولؐ سیدنا ابراہیم بن محمدؐ کی خواب گاہ ہے، یہیں فقیہ صحابہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فاتح عراق سعد بن ابی وقاص، سیدنا

سعد بن معاذ جن کی وفات پر عرش الٰہی جنبش میں آگیا تھا، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف اور دوسرے اکابر صحابہ مدفون ہیں، وہاں سے آگے چلیے تو شمالی مغربی جانب دیوار سے متصل وہ شہداء صحابہ واہل مدینہ جن کو واقعہ حرہ میں یزید کے دور حکومت میں ۶۳ھ میں شہید کیا گیا تھا، مدفون ہیں، اس کے بعد بقیع کے بالکل کونہ پر مشرقی شمالی جانب امام مظلوم شہید الدار سیدنا عثمان بن عفانؓ آرام فرمارہے ہیں[1] یہاں پر کچھ دیر ٹھہریے، اور محبت وعظمت کے جو آنسو سیدنا ابوبکرؓ وسیدنا عمرؓ کے مرقد پر بہنے سے بچ رہے تھے، ان کو ان کے تیسرے ساتھی کی خاک پر بہایئے ؎

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اس کے آگے سیدنا ابوسعید خدریؓ، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی والدہ فاطمہ بنت الاسد کے مقابر ہیں، سب کو سلام عرض کیجئے اور فاتحہ پڑھئے۔

پھر ایک لمحہ ٹھہر کر پورے بقیع پر عبرت وتفکر کی نظر ڈالئے، اللہ اکبر! کتنے سچے تھے، یہ اللہ کے بندے جو کچھ کہتے تھے کر دکھایا "رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ" مکہ میں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا، مدینہ میں اسی کے قدموں میں پڑے ہیں ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

گنبد خضرا پر ایک نظر ڈالئے، پھر مدینہ کے اس شہر خموشاں کو دیکھئے، صدق واخلاص، استقامت ووفا کی اس سے زیادہ روشن مثال کیا ملے گی، آیئے بقیع میں اسلام کی خدمت کا عہد کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اسلام ہی کے راستہ پر زندہ رکھے اور اسی کے ساتھ وفاداری میں موت آئے، جنت البقیع کا یہی پیغام اور یہاں کا یہی سبق ہے۔

[1] اکثر زائرین سب سے پہلے یہاں حاضر ہوتے ہیں۔

قبا میں بھی حاضری دیجئے، یہ وہ بقعۂ نور ہے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قدوم سے مدینہ سے بھی پہلے مشرف ہوا، وہاں اس مسجد کی بنیاد رکھی گئی ہے جس کو "لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ" کا خطاب ملا محبت و عظمت کے ساتھ حاضر ہوجئے اس زمین پر نماز پڑھئے پیشانی اس خاک پر رکھئے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور "رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا" کے قدموں سے پامال ہوئی ہے، اس فضا میں سانس لیجئے جس میں وہ انفاس قدسی اب بھی بسے ہوئے ہیں۔

برزمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود

سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

آج جبل احد اور اس کے مشہد میں (جس کو یہاں عرف عام میں "سیدنا حمزہؓ" کہتے ہیں) حاضری کی باری ہے، دو تین میل کی مسافت کیا، بات کرتے کرتے پہونچ گئے، یہ وہ زمین ہے جو اسلام کے سب سے قیمتی خون سے سیراب ہوئی، سب سے سچے، سب سے اچھے، سب سے اونچے عشق و محبت اور وفا کے واقعات جو دنیا کی پوری تاریخ میں نہیں ملتے اسی سرزمین پر پیش آئے، سید الشہداء حمزہؓ کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اسلام کی وفاداری میں یہیں اعضا کاٹے گئے اور جگر کھایا گیا عمارۃ بن زیاد نے قدموں پر آنکھیں مل مل کر یہیں جان دی، انس بن النضر کو جنت کی خوشبو اسی پہاڑ کے دامن سے آئی اور اسّی سے اوپر زخم کھا کر یہیں سے رخصت ہوئے، دندانِ مبارک یہیں شہید ہوئے سر پر زخم یہیں آئے، عشاق نے اپنے ہاتھوں اور پیٹھ کو محبوبؐ کے لئے سپر یہیں بنایا، مکہ کا ناز پروردہ مصعب بن عمیرؓ یہیں ایک کمبل میں شہید ہوا اور ایک کمبل میں دفن ہوا، یہاں اسلام کے شیر سوتے ہیں، یہ پوری زمین شمع نبوت کے پروانوں کی خاک ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عشاق اور اسلام کے جاں نثاروں کی بستی ہے ؎

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدّس ہے قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

یہاں کی فضا اور یہاں کے پہاڑ اب بھی "موتوا علیٰ مامات علیہ رسول اللہ" (اسی پر جان دو جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے گئے[۱]) کی صدائے بازگشت آتی ہے، آیئے اسلام پر جینے اور جان دینے کا عہد پھر تازہ کریں۔

مدینہ طیبہ کے ذرہ ذرہ کو محبت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھئے، تنقید کی نگاہ اور اعتراض کی زبان کے لئے دنیا پڑی ہوئی ہے، زندگی کے چند دن کانٹوں سے الگ پھولوں میں گزر جائیں تو کیا حرج ہے، پھر بھی اگر آپ کی نگاہ کہیں رکتی اور اٹکتی ہے تو غور سے کام لیجئے، وہ ہماری کوتاہی کے سوا اور کیا ہے، ہم نے دین اور دنیا کی خیرات یہیں سے پائی، آدمیت یہیں سے سیکھی، یہاں کی دستگیری نہ ہوتی تو ہم میں سے کتنے معاذ اللہ بت خانہ، آتش کدہ اور کلیسا میں ہوتے، لیکن ہم نے اس کا کیا حق ادا کیا، یہاں کے بچوں کی تعلیم و تربیت، یہاں کے لوگوں میں دین کی روح اور مقصد کا احساس پیدا کرنے کی کیا کوشش کی، فاصلہ کا عذر صحیح نہیں، ان کے بزرگوں نے سمندر اور صحرا عبور کر کے اور پہاڑوں کو طے کر کے دین کا پیغام ہم تک پہونچایا، ہم نے بھی اپنے فرض کا احساس کبھی کیا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ دین کے احسان کا بدلہ ہم چند سکوں سے ادا کر دیں گے جو ہمارے حجاج اپنی کم نگاہی سے احسان سمجھ کر مدینہ کی گلیوں میں بانٹتے پھرتے ہیں۔

مدینہ دعوت اسلامی کا معدن ہے، اس دعوت کو اس معدن سے اخذ کیجئے اور اپنے اپنے ملک کے لئے یہ سوغات لے کر آیئے، کھجوریں، گلاب و پودینہ، خاک شفا محبت کی نگاہ میں سب کچھ ہیں مگر اس سرزمین کا اصلی تحفہ اور یہاں کی سب سے بڑی سوغات دعوت اور اسلام کے لئے جد و جہد اور جان

---

[۱] یہ مقولہ حضرت انس بن النضرؓ کا ہے، انھوں نے صحابہ کو احد کے میدان میں مٹھا ہوا دیکھا پوچھا کیوں بیٹھے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے اب لڑ کر کیا کریں گے؟ کہا تو پھر اسی پر تم بھی جان دے دو جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جان دی۔

دے دینے کا عزم ہے، مدینہ، مسجد نبوی ؐ کے چپہ چپہ، البقیع شریف کے ذرّہ ذرّہ، احد کی ہر ہر کنکری سے یہی پیغام آتا ہے، مدینہ آکر کوئی یہ کیسے بھول سکتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد ہی دعوت و جہاد پر پڑی تھی، یہاں وہی لوگ مکہ سے آکر آباد ہوئے تھے، جن کے لئے مکہ میں سب کچھ تھا، مگر دعوت و جہاد کے مواقع نہ تھے، یہاں کی آبادی دو ہی حصوں پر منقسم تھی، ایک وہ جس نے اپنا عہد پورا کر دیا اور اسلام کے راستہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، کوئی خوف، کوئی ترغیب اس کو اپنے مقصد سے باز نہ رکھ سکی، دوسرا وہ جس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی لیکن اللہ کو ابھی ان سے اور کام لینا منظور تھا، ان کا جو وقت گزرتا حالت انتظار میں گزرتا، شہادت کے اشتیاق میں گزرتا، مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا "یہی عالم اسلام کا حال ہونا چاہیے، یہاں بھی یا تو وہ ہونے چاہئیں جو اپنا کام پورا کر چکے، یا وہ جو وقت کے منتظر ہیں، تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو زندگی کے حریص اور دنیا پر راضی، موت سے خائف اور خدمت سے گریزاں ہوں، معاش میں سرتاپا منہمک اور عارضی مشاغل میں ہمہ تن غرق ہوں ان کی گنجائش نہ مدینہ میں تھی نہ عالم اسلام میں ہونی چاہیے۔

لیجئے، قیام کی مدت ختم ہونے کو آئی، کہتے ہیں کہ کل قافلہ کا کوچ ہے ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

اب رہ رہ کر اس قیام کے سلسلہ کی کوتاہیاں اور یہاں کے حقوق کی ادائی میں اپنی تقصیر دل میں چٹکیاں لیتی ہے، اب استغفار و ندامت کے سوا کیا چارہ ہے، آج کی رات مدینہ کی آخری رات ہے ذرا سویرے مسجد میں آجایئے ؎

تمتّع من شميم عرار نجد   فما بعد العشية من عرار

لیکن دل کو ایک طرح کا سکون بھی حاصل ہے، آخر جا کہاں رہے ہیں؟ اللہ کے رسول کے شہر سے اللہ کے شہر کی طرف، اللہ کے گھر سے جس کو محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنے پاک ہاتھوں سے بنایا، اللہ کے اس گھر کی طرف جس کو ان کے جد امجد ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے فرزند نے اپنے پاک ہاتھوں سے بنایا، اور جا کیوں رہے ہیں؟ اللہ کے حکم سے اور اللہ کے رسولؐ کی مرضی اور ہدایت سے، یہ دوری، دوری کب ہوئی ؎

نہ دوری دلیل صبوری بود
کہ بسیار دوری ضروری بود

آخری سلام عرض کیا، مسجد نبوی پر حسرت کی نگاہ ڈالی اور باہر نکلے، غسل کر کے احرام کی تیاری کرلی تھی، ذوالحلیفہ میں جانے کا موقع ملے نہ ملے، موٹر پر بیٹھے، محبوب شہر پر محبت کی نگاہ ڈالتے چلے، احد کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، اب مدینہ سے باہر ہو گئے جو لمحہ گزرتا ہے مدینہ دور اور مکہ قریب ہوتا جاتا ہے، الحمد اللہ کہ ہم حرمین کے درمیان ہی ہیں۔ ع

صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم[1]

---

[1] ماخوذ از مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" مندرجہ کتاب "آپ حج کیسے کریں؟"

حدیثِ مدینہ[1]

لوگوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ کچھ حجاز کی باتیں کرو، جو کچھ وہاں دیکھا ہے، وہ ہمیں بھی دکھاؤ، مجھے یہ فرمائش بسروچشم قبول ہے کہ ع

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

مجھے وہ دن یاد نہیں جب مکہ اور مدینہ کا نام میرے لئے نیا تھا اور وہ پہلا دن تھا جب میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش اور اسلام کے گہوارے، رسولؐ کے شہر دار الہجرۃ کے بارے میں کچھ سنا ہو۔

میں نے تمام مسلمان بچوں کی طرح ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں حجاز اور ان دونوں متبرک شہروں کا تذکرہ ہوتا ہی رہتا ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگ تیزی میں اکثر "مکہ مدینہ" کہتے تھے، گویا وہ ایک ہی شہر کا نام ہے، وہ لوگ جب بھی ان میں سے کسی ... شہر کا ذکر کرتے تو دوسرے کا بھی ضرور ذکر کرتے، انھیں باتوں سے میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ دونوں ایک شہر کے نام ہیں، مجھے اس

---

[1] مصنف کی اس عربی تقریر کا ترجمہ جو ۱۹۵۱ء میں حجاز و مصر و شام کی واپسی پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے "فی مدالرسول" کے عنوان سے نشر کی گئی تھی، ان تقریروں کا ترجمہ "شرق اوسط میں کیا دیکھا" کے نام سے مشیر الحق صاحب بکری آبادی کے قلم سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا، یہ مضمون خفیف ترمیم کے ساتھ اسی مجموعے سے ماخوذ ہے۔

فرق کی تمیز اس وقت ہوئی جب میں کچھ بڑا ہو گیا اور مجھے کچھ عقل آ گئی، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ دونوں الگ الگ مستقل شہر ہیں اور ان کی درمیانی مسافت کچھ کم نہیں ہے۔

میں نے بچپن میں جس طرح لوگوں کو، جنت اور اس کی نعمتوں کا بڑے شوق سے ذکر کرتے ہوئے سنا، اسی طرح حجاز اور اس کے دونوں شہروں کا تذکرہ بھی سنا تھا، جنت کو حاصل کرنے اور حجاز دیکھنے کی تمنا اسی وقت سے میرے دل میں کروٹیں لینے لگی تھی۔

جب میں کچھ بڑا ہوا اور مجھے معلوم ہوا کہ جیتے جی جنت کو دیکھنا ممکن نہیں ہے، ہاں حجاز تک رسائی ممکن ہے، حجاج کے قافلے برابر آتے جاتے ہیں تو میں نے کہا کہ پھر ایمان کی اس جنت کی سیر کیوں نہ کی جائے، دن پر دن گزرتے گئے اور میں بڑھتا گیا، جب میں نے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا تو میرا پرانا شوق تازہ ہو گیا، تھپکی دے دے کر سلائی ہوئی تمنائیں جاگ گئیں اور میں دن ورات حج وزیارت کی تمنا میں رہنے لگا۔

پھر ایسا ہوا کہ میں اس جگہ آ پہونچا جس کی زمین پر نہ تو سبزہ کا فرش ہے، اور نہ اس کی گود میں ندیاں کھیلتی ہیں، اس کے چاروں طرف جلے ہوئے پہاڑ کھڑے پہرہ دے رہے ہیں، لیکن بقول حفیظ۔

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

جب میں نے حسن ظاہری سے خالی یہ سرزمین دیکھی تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ شہر مناظر سے کتنا تہی دست ہے ——— لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس شہر نے انسانیت اور تمدن پر کتنا بڑا احسان کیا ہے، اگر یہ شہر جس کا دامن گلکاریوں سے خالی ہے، روئے زمین پر نہ ہوتا تو دنیا ایک سونے کا پنجرا ہوتی اور انسان محض قیدی! ——— یہی وہ شہر ہے جس نے انسان کو

دنیا کی تنگنائے سے نکال کر وسعتوں سے آشنا کیا، انسانیت کو اس کی کھوئی ہوئی سرداری اور چھنی ہوئی آزادی دلائی، اسی شہر نے انسانیت پر لدے ہوئے بھاری بوجھوں کو اتارا، اس کے طوق و سلاسل کو جدا کیا جو ظالم بادشاہوں اور نادان قانون سازوں نے ڈال رکھے تھے۔

جس وقت میں نے یہ سوچا ــــــ اگر یہ شہر نہ ہوتا ــــــ؟ اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں دنیا کے بڑے بڑے شہروں کا اس شہر سے موازنہ کروں اور دیکھوں کہ اگر یہ شہر نہ ہوتے تو دنیا میں تمدن اور انسانیت میں کیا کمی ہوتی! ــــــ ــــــ میرے سامنے ایک ایک شہر آئے اور میں نے دیکھا کہ یہ تمام شہر مٹھی بھر انسانوں کے لئے زندہ اور آباد تھے، انھوں نے انسانیت کے سرمایہ میں کسی بڑی چیز کا اضافہ نہیں کیا یہ مختلف زمانوں میں انسانیت اور تمدن کے مجرم رہے ہیں، اپنے ذرا سے فائدہ کے لئے بارہا ایک شہر نے سیکڑوں شہروں کو بے چراغ کر دیا، ایک قوم نے بہت سی قوموں کو اپنی خوراک بنالیا، کتنی بار چند آدمیوں کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں انسان برباد کر دیئے گئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے نقشہ پر اگر یہ شہر نہ ہوتے تو انسانیت و تمدن کا کچھ نہ بگڑتا اور دنیا میں کوئی بڑی کمی نہ ہوتی۔

لیکن اگر مکّہ نہ ہوتا تو انسانیت ان معانی و حقائق، اخلاق و عقائد اور علوم و فضائل سے تہی دست ہوتی جو اس کا سب سے قیمتی سرمایہ اور اس کا سب سے بڑا حسن ہیں، اسی کی بدولت دنیا نے ایمان کی اس لازوال دولت کو پھر سے پایا جسے لوگ ضائع کر چکے تھے، عالم نے اس صحیح علم کو پایا جو ظن و تخمین کے پردوں میں چھپ چکا تھا، وہ عزت دنیا کو دوبارہ ملی جو سرکشوں اور ظالموں کے ہاتھوں پامال ہو چکی تھی ــــــ سچ تو یہ ہے کہ یہاں انسانیت نے نیا جنم لیا اور تاریخ نئے سرے سے ڈھل کر نکلی۔

لیکن مجھے ہوا کیا ہے جو میں کہتا ہوں، اگر مکہ نہ ہوتا ——— ؟ اگر مکہ نہ ہوتا تو کیا ہو جاتا؟ مکہ تو اپنے خشک پہاڑوں، ریتیلے ٹیلوں بلکہ خانہ کعبہ اور زمزم کے متبرک کنویں کو اپنی گود میں لئے ہوئے چھٹی صدی مسیحی تک برابر سوتا رہا ہے اور انسانیت سسکتی اور دم توڑتی رہی ہے، لیکن اس نے مدد کا کوئی ہاتھ نہ بڑھایا، مکہ اس وقت تک خشک پہاڑوں اور ریتیلے ٹیلوں سے گھرا ہوا، دنیا سے الگ تھلگ اس طرح زندگی کے دن کاٹ رہا تھا گویا انسانیت کے کنبہ سے اس کا کوئی جوڑ نہ تھا، دنیا کے نقشہ سے الگ تھا۔

اس لئے مجھے یہ کہنا چاہئے کہ مکہ نہیں بلکہ مکہ کا وہ عظیم الشان فرزند اگر نہ ہوتا جس نے تاریخ کے رخ کو بدل دیا، زندگی کے دھارے کو موڑ دیا اور دنیا کو ایک نیا راستہ دکھایا تو دنیا کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔

یہ سوچتے سوچتے میری آنکھوں کے سامنے چند مناظر پھر گئے، مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قریش کا سردار تن تنہا خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے، لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں، اس سے بدزبانی کر رہے ہیں، لیکن وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ طواف کر رہا ہے۔

جب وہ طواف ختم کرتا ہے تو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے، لیکن خانہ کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ اسے سختی سے روکتے ہیں، سردار صبر سے کام لیتا ہے، اور کہتا ہے "عثمان! وہ دن بھی کیا ہوگا، جب یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا اسے دوں گا؟" ——— عثمان کہتے ہیں "——— اس دن کیا قریش ختم ہو چکے ہوں گے؟ ———" وہ جواب دیتا ہے "نہیں بلکہ اس دن انھیں حقیقی عزت ملے گی۔"

پھر میں نے دیکھا کہ وہی سردار فتح مکہ کے دن خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے، اس کے وہ ساتھی جنھوں نے اپنے کو...... اس پر قربان کر دیا تھا، اس کے ارد گرد پروانہ وار جمع ہوئے ہیں، اس وقت وہ کعبہ کے کلید بردار کو بلاتا ہے اور کہتا ہے "عثمان! لو یہ تمہاری کنجی ہے آج کا دن نیکی اور ایفائے عہد کا دن ہے"۔

تاریخ شاہد ہے کہ وہ شخص صرف اس کنجی کا مالک نہیں ہوا جس سے وہ خانہ کعبہ کے دروازہ کو کھول سکتا تھا بلکہ اس کے پاس وہ کنجی بھی تھی، جس سے وہ انسانیت کے ان تالوں کو بھی کھول سکتا تھا، جو کسی حکیم اور فلسفی سے اس وقت تک نہیں کھل سکے تھے ــــــ یہ کنجی قرآن کریم ہے، جو اس پر نازل کیا گیا ــــــ رسالت ہے جو اسے سونپی گئی جو انسانیت کی ساری گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے اور ہر زمانہ کی مشکلات کا حل پیش کرتی ہے۔

حج کے بعد میں اپنے شوق کے پروں پر اڑتا ہوا مدینہ منورہ کی طرف چلا محبت اور وفا کی کشش مجھے مدینہ منورہ کی طرف بے ساختہ کھینچ رہی تھی، راستہ کی زحمتوں کو میں رحمت سمجھ رہا تھا اور میری نگاہ کے سامنے اس پہلے مسافر کا نقشہ گھوم رہا تھا جس کا ناقہ اسی راستہ سے گیا تھا اور اس نے اس راستہ کو اپنی برکتوں سے بھر دیا تھا۔

جب میں مدینہ منورہ پہونچا تو سب سے پہلے میں نے مسجد نبوی میں دو رکعت نماز ادا کی اور سعادت کے نصیب ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا، پھر میں آپؐ کے سامنے حاضر ہوا، میں آپؐ کے ان احسانات کے نیچے دبا ہوا تھا، جن سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، میں نے آپؐ پر درود و سلام پڑھا اور گواہی دی کہ بے شک آپ نے اللہ کا پیغام کما حقہ پہونچا دیا، اللہ تعالےٰ کی طرف سے سونپی ہوئی امانت کو پورا پورا ادا کر دیا، اُمت کو سیدھی راہ دکھائی اور اللہ کی راہ میں دم واپسیں تک پوری پوری کوشش کی، اس کے بعد میں نے آپ کے دونوں محترم دوستوں کو سلام کیا،

یہ دونوں ایسے دوست ہیں جن سے بڑھ کر مصاحبت کا حق ادا کرنے والا تاریخ انسانی میں نظر نہیں آتا اور نہ کوئی ایسا جانشین دکھائی دیتا ہے جس نے ان سے زیادہ اچھی طرح جانشینی کے فرائض کو ادا کیا ہو۔

درود و سلام سے فارغ ہو کر میں جنت البقیع کی طرف گیا، یہ زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ ہے، جہاں صدق وصفا، مہر و وفا کا انمول خزانہ دفن ہے۔ ع

دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

یہیں وہ لوگ سو رہے ہیں، جنھوں نے آخرت کے لئے دنیا کی زندگی کو تج دیا، یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اپنے یقین اور اپنے دین کی خاطر وطن پر غریب الوطنی کو ترجیح دی، انھوں نے رسولؐ کے قدموں پر پڑے رہنے کے لئے رشتہ داروں اور دوست احباب کے پڑوس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔

رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔	بعض لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا اسے سچ کر دکھایا۔

یہاں سے فارغ ہو کر میں احد کی طرف گیا، احد وہ پاک اور دلکش سرزمین ہے، جہاں محبت و وفاداری کا سب سے دلکش منظر دیکھنے میں آیا، اسی میدان میں انسانی تاریخ نے ایمان و یقین کو جیتے جاگتے کرداروں کی شکل میں دیکھا، یہیں سے بہادری اور شجاعت کے الفاظ لغت کو میسر ہوئے، اسی خطہ نے پاک محبت اور نادر دوستی کا نمونہ دنیا کو دکھایا، یہاں پہونچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں" ـــــــ مجھے احد پہاڑ کے اسی طرف سے جنت کی خوشبو آرہی ہے ـــــــ " مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خبر شہادت سن کر کہہ رہے

ہوں ــــــ "اب آپ کے بعد جنگ وجہاد کا کیا لطف؟ ــــــ" اور انسؓ بول اُٹھے ہوں" ــــــ لیکن آپ کے بعد زندگی کا بھی کیا مزا؟ ــــــ"

اسی احد پہاڑ کی گود میں حضرت ابو دجانہؓ نے اپنی پشت کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ڈھال بنا دیا تھا، تیر ابو دجانہؓ کی پشت کو چھید رہے تھے، لیکن انھیں جنبش بھی نہ ہوتی تھی، اسی جگہ حضرت طلحہؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر برسنے والے تیروں کو اس طرح اپنے ہاتھ پر لیا کہ ہاتھ شل ہو کر رہ گیا، اسی میدان میں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو قریش کے بڑے ناز پرورده نوجوان تھے، اسی جگہ اس حالت میں شہید ہوئے کہ ان کے لئے کفن بھی میسر نہ تھا، ایک کمبل تھا جس سے اگر سر چھپایا جاتا تو پیر کھل جاتے پیر ڈھانکے جاتے تو سر برہنہ ہو جاتا۔

اے کاش! احد دنیا والوں کو اپنے اس محبت کے خزانہ سے کچھ دے دیتا، کاش آج دنیا کو اس پچھلے ایمان اور یقین کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہو جاتا، اگر ایسا ہو جائے تو اس دنیا کی قسمت بدل جائے اور یہ دنیا جنت بن جائے۔

لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ہمیں قاہرہ کی سیر کرائی اور وہاں کی اہم شخصیتوں سے تعارف کرایا، تم نے دمشق اور اہلِ دمشق کی باتیں سنائیں اور وہاں کے ادباء و علماء سے ملایا، تم ہمیں شرق اوسط لے گئے اور وہاں کی سیر کرائی، اب حجاز اور حجاز کی نمایاں شخصیتوں کا بھی تعارف کراؤ ــــــ لیکن میں کیا کروں حجاز کی تو ایک ہی ہستی ہے، جس کی باتیں کئے جایئے جس کی وجہ سے حجاز، حجاز ہے، اور عالم اسلام، عالم اسلام ہے۔ ع

آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است

سورج کے سامنے ستاروں اور چراغوں اور اس کی روشنی سے روشن ہونے والے ذروں کا کیا ذکر، بس یہی حجاز کی کہانی ہے اور یہی حجاز کا تعارف!

ما انچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

سیّد العرب و العجم کے حضور میں

شعرائے عجم کا خراجِ عقیدت

فارسی شعراء کی نذرِ عقیدت[1]

اللہ تعالیٰ میرے ایک عزیز دوست کو جزائے خیر دے، ان کا دستور ہے کہ اپنے دوستوں کے لئے کام ودہن کی لذت اور نائے ونوش کی دعوت کے بجائے، ذوق کی ضیافت اور افسردہ جذبات اور خوابیدہ خیالات کے لئے نشاط اور کیف وانبساط کا سامان کرتے رہتے ہیں، وہ اکثر ایسی ادبی محفلیں منعقد کرتے ہیں جن میں ادباء وشعراء یا تو اپنا کلام پیش کرتے ہیں یا قدیم شعراء کے موثر اور پرسوز اشعار پڑھ کر سناتے ہیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے دلوں میں حرارت اور زندگی کی ایک تیز رو دوڑ جاتی ہے، ان میں رقت اور سوز وگداز کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، بعض وقت آنکھیں بھی اشکبار ہو جاتی ہیں، اور ان کا گرد وغبار اور میل کچیل اچھی طرح ڈھل جاتا ہے، مادیت کی گہری بدلیاں چھٹ جاتی ہیں، اور شرکائے محفل تھوڑی دیر کے لئے اپنی اس دنیا سے جو فکروں، مصیبتوں اور تلخ کامیوں سے پُر ہے اور زندگی کے تقاضوں اور مطالبوں کے بھاری بوجھ کے نیچے دبی جارہی ہے، جس کی

---

[1] یہ ترجمہ مولوی محمد الحسنی کے قلم سے ہے، ایرانی شعراء کے اشعار کے انتخاب میں پروفیسر غلام دستگیر رشید کی رہنمائی شامل ہے جنھوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے فارسی میں نعتیہ کلام کے موضوع کا انتخاب کیا، بعد میں اس میں چند اضافے دوسری کتابوں سے کئے گئے۔

ہر چیز گرانبار اور وبالِ دوش ہے، جس کا ہر قدم بھاری زنجیروں کے ساتھ اٹھتا ہے، اور گھسٹتا ہوا چلتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ بدقت تمام بلندی کی طرف بڑھنے اور آسمان پر چڑھنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن ان طوق و سلاسل سے مجبور ہے، ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتے ہیں، جہاں صرف شوق و ذوق کی حکمرانی ہے، اور جہاں ہر وقت عالم قدس کی روح پرور اور جاں نواز ہوائیں چلتی رہتی ہیں، یہاں پہونچ کر ان کو روح کی بالیدگی، قلب کے سرور، احساس کی لطافت اور نفس کی پاکیزگی کا عجیب احساس ہوتا ہے، وہ زندگی کی لذت، رفعت اور لطافت سے آشنا ہوتے ہیں، زندگی کا آتشکدہ گل و گلزار بن کر مہک اٹھتا ہے، اور اس کی ہر کثافت سُبک اور لطیف ہو جاتی ہے۔

انھوں نے کل ایک ایسی محفل منعقد کی جس کا موضوع یہ تھا کہ "سید العرب والعجم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں" شعرائے عجم نے اپنے شوق و ذوق محبت و وارفتگی کا کس طرح اظہار کیا ہے، اور مدینۃ النبیؐ کے شوق و انتظار کے باب میں اپنے ایمان و یقین اور شوق و محبت کے کیا نمونے پیش کئے ہیں۔

جو اہلِ نظر اسلام کے عالمی ادب سے باخبر ہیں، اور جنھوں نے مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کی زبان اور ادبیات کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے اشعار سے لطف اندوز ہوئے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فارسی زبان نعت گوئی اور مدح رسولؐ میں سب سے زیادہ خوش نصیب اور سرمایہ دار ہے، اس کے بعد اُردو زبان کا نمبر آتا ہے، جو خود فارسی ادب کی خوشہ چیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کی پیداوار ہے، یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر جتنا طاقت ور، زندہ، موثر نرم و شیریں اور پرسوز کلام ان دونوں زبانوں میں ملتا ہے، اتنا کسی اور زبان میں نہیں ملتا، اس میں جذبات کی جو فراوانی اور گرمی و بے چینی نظر آتی ہے، وہ دوسری ادبیات میں نظر نہیں آتی اور یہ واقعہ ہے کہ عجمی نژاد شعراء نے....

ایسے مضامین اور خیالات پیش کئے اور ایسی نئی نئی تعبیریں ایجاد کیں جن میں ان کا پیش رو کوئی نہ تھا۔

یہ ادبیاتِ اسلامی کی تاریخ کا ایک علمی سوال ہے جس کا ابھی تک تشفی بخش جواب نہیں دیا گیا۔

بعض اہلِ نظر نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ اس کا تعلق ایرانی اور ہندوستانی مزاج سے ہے، وہ کہتے ہیں کہ اہلِ ایران اور اہلِ ہند دونوں کے خمیر میں عشق و محبت شامل ہے اور ان کی افتاد اسی پر ہوئی ہے اس لئے ان کی زبان بھی شوق و آرزو کی زبان اور عشق و محبت کی ترجمان ہے، جب اس صلاحیت کا رخ ایک ایسی شخصیت کی طرف ہوا جس کو حسن و احسان کا سب سے بڑا پیکر اور جمال و کمال کا سب سے لطیف مظہر کہنا ہر طرح بجا ہے تو اس نے قدرتی طور پر اپنے کلام کے ایسے عجیب و غریب اور نادر نمونے پیش کئے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں، زورِ تعبیر اور حسنِ تصویر نے جذبۂ محبت، بے تابیٔ دل اور تاثیرِ عشق کے ساتھ مل کر اپنے محبوب و ممدوح کی تعریف میں جن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی محبت کی جلوہ گاہ بنایا ہے اور ظاہری و باطنی جمال کی سب سے قیمتی پوشاک سے نوازا ہے، ایک ایسا سماں باندھا جس میں دل آویزی اور دل ربائی کا پورا سامان موجود تھا۔

بعض لوگوں نے اس کی توجیہ دوری اور ہجر سے کی ہے اس لئے کہ محبت اور دل کے سرچشموں اور سوتوں کو چھیڑنے، نئی نئی تعبیرات اور معانی کا سہارا لینے اور خوابیدہ صلاحیتوں اور مخفی قوتوں کو بروئے کار لانے اور دبی ہوئی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنانے میں ان دونوں چیزوں کا بہت بڑا حصہ ہے، ان میں سے اکثر شعرا جزیرۃ العرب اور مدینہ منورہ سے بہت دور تھے، نیز اس عہد میں حجاز کا سفر اتنا آسان نہ تھا، انتشار اور بدامنی کا دور دورہ تھا اور حجاج کے قافلے اکثر و بیشتر غارت گری اور رہزنی کا شکار ہو جایا کرتے تھے، اس پُرخطر اور طویل سفر کی دشواریاں، موانع کی کثرت اور زیارت سے محرومی، یہ وہ باتیں تھیں جن کی تلافی وہ ان شوقیہ اشعار سے کرنا چاہتے تھے، جن کو ہمیشہ دل کا نامہ بر سمجھا گیا ہے، اور جو واقعی نامہ بر کبوتر کی طرح منزلِ مقصود پر پہونچے بغیر دم بھی نہیں لیتے۔

بعض لوگوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس کی بڑی وجہ تصوف ہے، جو ایران اور ہندوستان میں بہت بارآور رہا ہے، اور جو (باوجود اس کے کہ بہت سے ناقدین و معترضین نے غلط یا صحیح طور پر اس کو اپنا ہدف بنایا ہے) جذبۂ محبت کی آبیاری اور اس کی پرورش اور ترقی میں بہت موثر اور فعال عنصر ہے، یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس کی بنیاد بھی محبت اور دلی کیفیات وجذبات پر تھی اور جن لوگوں کو اس محبت اور ان قلبی کیفیات کا کچھ بھی حصہ نہ مل سکا، وہ اکثر اس میں زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئے، بہرحال یہ تصوف جس نے ایرانی ادبیات کی پورے سفر میں رفاقت کی اور جس نے ان کی توسیع وترقی اور ان کی آرائش وزیبائش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ اس غزل گوئی اور نازک دلی جذبات کی ترجمانی اور عشقیہ اشعار کا بہت بڑا سرچشمہ تھا، جب پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو چھلکنے بھی لگتا ہے اور جب چھلکنے لگتا ہے تو پھر بہہ بھی پڑتا ہے، جام وسبو کے بعد بے خودی لازمی ہے، اور بے خودی کے ساتھ کچھ نغمہ سرائی بھی قابل معافی ہے، ایک عرب شاعر نے اسی حقیقت کو کتنے خوبصورت پیرایہ میں ادا کیا ہے اور تمام اہلِ دل کی ترجمانی کی ہے۔

سقونی وقالوا لا تغنّ ولو سقوا

جبال سلیمیٰ ما سُقِیتُ لَغَنَّتْ[1]

بہرحال اس کے جو بھی اسباب ہوں، فارسی شاعری کا دامن خواہ وہ ایران کی ہو یا ہندوستان کی نعت گوئی کے آبدار اور بیش قیمت موتیوں سے پوری طرح بھرا ہوا ہے، اور میرے ان فاضل دوست نے اس بزم کے لئے اس موضوع کا انتخاب کرکے بلا شبہہ اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔

شرکائے بزم میں سے اکثر ادباء و شعراء نہ صرف فارسی زبان سے واقف بلکہ اس کے لذت آشنا

---

[1] انھوں نے مجھے جی بھر کے پلایا، پھر یہ حکم بھی صادر فرمایا کہ خبردار گانا مت، حالانکہ جو کچھ انھوں نے مجھے پلایا ہے، وہ اگر سلیمیٰ کے پہاڑوں کو پلا دیتے تو وہ بھی شاید نغمہ سرا ہو جاتے۔

تھے ان کو کسی ترجمہ و تشریح کی ضرورت نہ تھی، لیکن کچھ فاضل عرب دوست بھی اس بزم میں شریک تھے وہ اس زبان سے ناواقف تھے، لیکن فارسی زبان کی حلاوت اس کی دل آویز موسیقی اور خوش آوازی کا لطف اٹھانے میں وہ بھی شریک اور حصہ دار تھے، ان کی خاطر ایک فاضل دوست نے جو دونوں زبانوں کا ذوق رکھتے تھے ان اشعار کے ترجمہ و ترتیب کی خدمت اپنے ذمہ لی اور اس طرح اس محفل میں کوئی بھی محروم و بے ذوق نہیں رہا۔

اب ہماری بزم کے اس تمثیلی مشاعرہ کا آغاز ہوا جس کے لئے میزبان نے پہلے سے خاصی تیاری کر رکھی تھی، انھوں نے متعدد ادبار و شعراء اور تعلیم یافتہ و شائستہ نوجوانوں کو ایران اور ہندوستان کے مشہور فارسی شعراء کا کلام یاد کرا دیا اور انھوں نے بھی بہت اچھی طرح اس کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھا اور بہت دل آویز اور اچھے انداز میں اس کی ایسی باوقار تمثیل اور کامیاب تصویر کشی کی جس میں حسن ذوق اور حسن ادب دونوں چیزوں کی جلوہ فرمائی نظر آرہی تھی۔

سب سے پہلے اس بزم کو شیخ سعدی نے رونق بخشی اور حاضرین کے سامنے تشریف لائے ان کی نگاہِ انتخاب جن اشعار پر ٹھہری وہ سہل ممتنع، بہت جامع و مانع اور سامعہ کے لئے بہت خوشگوار تھے، ان میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ پورے پورے کتب خانوں کا عطر ایک ایک سطر میں کھینچ کر لے آیا گیا تھا۔

وہ کہتے ہیں کہ ایک ایسے یتیم بچہ نے جو صحیح طریقہ پر لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتا تھا ہفت اقلیم کے سارے کتب خانوں پر پانی پھیر دیا اور خط نسخ کھینچ دیا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ ہفت ملت بشست

انھوں نے اپنے اس شعر میں اس انقلاب عظیم کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی جس نے

مذہب وادیان، اخلاق واجتماع، علوم وآداب اور تہذیب وتمدن کے میدان میں دنیا کے تمام قدیم وجدید انقلابات کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا، وہ کہتے ہیں کہ کیسا عجیب وغریب معجزہ ہے کہ ایک ایسے اُمّی نے جو ایک دن بھی کسی مکتب میں نہیں بیٹھا جس نے ایک ورق بھی کبھی سیاہ نہیں کیا اُس نے ایک ایسے دورِ علم کا آغاز کیا جس کو کوئی منسوخ نہ کرسکا اور جس کی رفعت کے سامنے سارے زمانے بلکہ پوری تاریخ انسانیت نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ مکمل ناخواندگی سے اتنا بڑا علم آخر کیسے وجود میں آگیا۔

یہ ایک ایسا اہم سوال ہے جس کی قدرت الٰہی کے سوا کسی اور چیز سے توجیہ نہیں کی جاسکتی، اور اگر تواتر، بداہت، مشاہدہ اور قطعی تاریخی مسلمات اور حقائق اس کے ساتھ نہ ہوتے تو شاید اس پر یقین لانا بھی مشکل ہوتا۔

اس کے بعد شیخ فریدالدین عطارؒ[1] کی باری آئی، ان کے پُر درد اور حلاوت آمیز اشعار میں، انابت، تواضع وانکسار، خوف وخشیت اور احساس عجز کا پہلو نمایاں تھا، وہ ایک شعر میں بڑے درد واثر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کے اس مکرم نام کا بھی ایک حق ہے جس سے ان کو موسوم کیا گیا ہے، اس لئے کہ شرفاء و اہل کرم کا دستور ہے کہ ان کے متعلقین میں سے اگر کسی کا نام ان کے نام پر رکھ دیا جائے وہ آخر دم تک اس کی لاج رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ اچھا سلوک پسند کرتے ہیں۔

گرچہ ضائع کردہ ام عمر از گناہ — توبہ کردم عذر من از حق بخواہ

اے شفاعت خواہ بینی تیرہ روز — لطف کن شمع شفاعت بر فروز

از گنہ رویم مگر دانی سیاہ — حق ہم نامی من داری نگاہ

ان کے بعد امیر خسروؒ[2] رونق افروز محفل ہوئے شعرائے ایران کے یہاں بھی ان کی استادی، صحتِ زبان مسلّم ہے اور اُن کا کلام اساتذۂ ایران کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے ان کے آتے ہی لوگوں کی

---

[1] ان کا نام ان کے والد نے محمد رکھا تھا لیکن فریدالدین عطار کے نام سے مشہور ہوئے، ۶۲۷ھ میں وفات پائی۔
[2] وفات ۷۲۵ھ

نگاہیں بے ساختہ ان کی طرف اٹھ گئیں اور انھوں نے بھی اپنی شیریں نوائی اور مخصوص ترنم سے حاضرین کا دل جیت لیا۔

انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیدا کردہ محیر العقول انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے ابولہب کے اس چراغ کو ایک پھونک میں بجھا دیا جو سارے نشیمن کو جلا دینے کے لئے بے چین تھا اور دو گام میں آپ نے اس جہان سے اس جہان اور مکان سے لامکان کا سارا فاصلہ طے کر لیا۔

دمِ خُلقش کہ جاں دادہ عرب را　　فرو کشتہ چراغِ بولہب را

دو گامے زیں جہاں تا آں جہانش　　دو جولان از مکاں تا لامکانش

ان کے بعد مولانا جامیؒ تشریف لائے، نعت گویانِ عالم کی باتوقیر مجلس کی صدارت انھیں کو زیب دیتی تھی، سب نے ان کی تعظیم کی اور محفل میں سب سے ممتاز جگہ پر بٹھایا، انھوں نے اس موقع پر اپنی ایک مشہور نعت پیش کی، اس میں وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ نے کسی سادہ ورق کو سیاہ نہیں کیا یا کسی سیاہی میں مزید سیاہی کا اضافہ نہیں فرمایا تو اس میں کیا نقص کی بات ہے آپ نے تو پوری کائنات کو روشنی عطا کی ہے آپ کے طفیل میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے گئے اور کتنے سیاہ اعمال نامے دُھل گئے اور روشن ہو گئے، آپ کی امت کے اہل قلم اور مصنفین نے دنیا کے کتب خانے بھر دیئے، آپ کے جمال اور آپ کے رخ انور نے عرب و عجم سب ہی کو اپنا اسیر بنایا، آپ کی فصاحت و بلاغت نے سب کے دلوں کو تسخیر کیا ہے۔

اے عربی نسبت و امی لقب　　بندۂ تو ہم عجم و ہم عرب

تیغ عرب زن کہ فصاحت تراست　　صید عجم کن کہ ملاحت تراست

لہ　وفات ۸۹۸ھ

چوں زتو خوانند و نویسند ہم ۔۔۔ گر تو نخوانی نہ نویسی چہ غم

از سیاہ راست سفیدی امید ۔۔۔ بہ کہ سیاہی نہ نہی بر سپید

ان بلیغ اشعار نے حاضرین کے دل پر خاص اثر کیا، ان کی آتش شوق اور بھڑک اٹھی اور زبان حال سے لوگوں نے بیک زبان کہا۔

مصلحت نیست مرا سیری ازیں آب حیات

ضاعف اللّٰہ بہ کل زمان عطشی

فرمائش قبول کرتے ہوئے مولانا نے کچھ اشعار اور پیش کیے، وہ کہتے ہیں کہ کعبہ بتوں سے بھرا ہوا تھا اور حرم طالبین خدا پر تنگ تھا، آپ نے آکر ان بتوں کی ایسی بیخ کنی کی کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا، آپ کے مبارک قدموں کی برکت سے مقام ابراہیم، مقام ابراہیم بنا اور اس نے اپنا درجہ دوبارہ حاصل کر لیا۔

کعبہ بے وے از بتاں پُرسنگ بود ۔۔۔ برخدا جویاں حریمش تنگ بود

سعی او از بیخ وبُن برکند شاں ۔۔۔ در بیابانِ عدم افگند شاں

شد قدم گاہ خلیل او را بکام ۔۔۔ عالی از یمن قدومش آں مقام

حاضرین نے ان اشعار سے محظوظ ہوکر ان سے مزید فرمائش کی، ان کو معلوم تھا کہ مولانا جامی نے کس شوق و ذوق کے ساتھ مدینہ منورہ کا سفر کیا اور کس عاشقانہ ادا اور فدائیانہ شان کے ساتھ مسجد نبوی میں حاضری دی اور اپنا وہ مشہور و معروف قصیدہ کہا جو ہر فارسی داں کے نوک زبان اور اس کے دل کا ترجمان ہے، بعض اشعار لوگوں کو حفظ ہو گئے اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے، انھوں نے اس کی خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی اس نعت سے اہل بزم کو محروم نہ رکھیں، اس نعت کا نام آتے ہی مولانا پر خاص کیفیت طاری ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ خود ان کی

خواہش اوران کے دل کی بات تھی اس فرمائش نے ان کے سازِ دل کو چھیڑ دیا۔

وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ میں اپنی پلکوں سے آپ کے آستانہ پر جاروب کشی کروں اور اپنی قسمت پر ناز کروں، میں نے اپنی جان کو آپ کی شمع فروزاں کا پروانہ بنالیا، میری بے خواب آنکھوں نے جو دیدار محبوب کے انتظار میں بہت عرصہ سے نہیں سوئیں آپ کے حریم پاک پر مینھ برسایا اور سقائی کی خدمت انجام دی، جہاں جہاں آپ کے قدم پڑے اس کو میں نے اپنی آنکھوں کے خون سے دھویا اور جہاں خدا کے سچے بندوں نے نماز پڑھی وہاں میں نے بھی اس لئے نماز پڑھی کہ خدا مجھے بھی راستی اور مقام صدق عطا کرے۔

خوشا کز گرد رہ سویت رسیدیم — بدیدہ گرد از کویت کشیدیم
بمسجد سجدۂ شکرانہ کردیم — چراغت را زجان پروانہ کردیم
زدیم از اشک ابر چشم بے خواب — حریم آستانہ روضہ ات آب
بسوئے منبرت رہبر گرفتیم — زچہرہ پایہ اش از در گرفتیم
زمحرابت بسجدہ کام جستیم — قدم گاہت بخونِ دیدہ شستیم
بپائے ہر ستوں قد راست کردیم — مقام راستاں درخواست کردیم

مولانا جامی کے بعد مشہور ایرانی شاعر اور فارسی شاعری میں مستقل مدرسۂ فکر کے بانی عرفی[1] اس بزم کے سامنے آئے، مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک درباری شاعر اور سلاطین و امراء کے مداح و ثنا خواں ہیں لیکن انھوں نے بڑے مناسب انداز میں معذرت کرتے ہوئے کہا کہ امراء و سلاطین اور سید الاولین والآخرین کی مدح ایک آہنگ کے ساتھ کیسے کی جاسکتی ہے ایک سانس میں شہ کونین کی ثنا خوانی اور دوسری سانس میں "کے وجم" کی مدح سرائی بڑی بے ادبی اور بد ذوقی ہوگی، انھوں نے کہا۔

---

[1] وفات ۹۹۹ھ

آنا نبود وصف اضافی ہنر ذات — این فتوئ ہمت بود ارباب ہمم را
دوراں کہ بود تا کند آرائش مسند — مداح شہنشاہ عرب را و عجم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن — نعتِ شہِ کونینؐ و مدیحِ کے وجم را

عرفی کے جانے کے بعد مشہور نعت گو شاعر قدسی[1] رونق افروز بزم ہوئے، قدسی کے کلام کی صدائے بازگشت تصوف کے حلقوں میں آج تک گونج رہی ہے، وہ ترنم، آہنگ اور ان کے اشعار اوزان وقافیہ کے اعتبار سے بھی ممتاز ہیں، عربی الفاظ کی جا بجا شمولیت نے ان کی دلآویزی میں اور اضافہ کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ غزل خواں زیادہ تر ان ہی کے کلام کے دلدادہ ہیں، اور شعراء وصوفیاء نے کثرت سے ان کی نعت کی تضمین کی ہے، انھوں نے اپنی مشہور نعت پڑھی۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی — دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
من بیدل بجمال تو عجب حیرانم — اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی
چشم رحمت بکشا سوئے من انداز نظر — اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آب حیات — رحم فرما کہ زحد می گذرد تشنہ لبی
عاصیانیم زِ ما نیکی اعمال مپرس — سوئے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی — آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

ایرانی شعراء کا دور ختم ہوا اور ہندوستان کے مسلم الثبوت فارسی گو شعراء کی باری آئی، امیر خسرو جو ہندوستان کے فارسی گو شعراء کے امام ہیں، اہلِ زبان اور بلند پایہ شعرائے ایران کے پہلو میں تشریف رکھتے تھے کہ وہ کسی حیثیت سے بھی ان سے کم نہیں، بلبل شیراز (شیخ سعدیؒ) نے بھی ان کی شیریں نوائی اور زبان آوری کی داد دی تھی، وہ اپنا کلام سنا چکے تھے، مرزا غالب ہندوستانی شعراء کی صف سے

---

[1] متوفی ۱۰۵۶ھ

اٹھے اور اس سعادت میں شرکت کی اجازت چاہی کہ ان کو بھی اپنے فارسی کلام پر ناز تھا، ان کے چند بلند پایہ معاصرین نے اس دعوے کو شک کی نگاہ سے دیکھا، کچھ حاضرین نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ اس موضوع سے ان کو کیا مناسبت؟ لیکن انھوں نے اس کی پرواہ کئے بغیر اپنا کلام سنانا شروع کر دیا، اور اپنے طرزِ عام کے خلاف نہایت سلیس، عام فہم اور سادہ نعتیہ اشعار پڑھے، جن میں تخیل آرائی نازک خیالی اور مبالغہ آمیزی کے بجائے حقائق اور واقعات بیان کئے گئے ہیں، ساری محفل اس کلام سے محظوظ ہوئی اور اہلِ زبان نے بھی ان کو بے تکلف داد دی، انھوں نے پڑھا ؎

بہ دستش کشادِ طلسم نارسا　　　بہ کلکش سوادِ قلم نارسا
بہ رفتار صحرا گلستاں کنی　　　بہ گفتار کافر مسلماں کنی
بہ دنیا ز دیں روشنائی دہی　　　بہ عقبیٰ ز آتش رہائی دہی
ز بت بندگی مردم آزاد کن　　　جہانے بہ یک خانہ آباد کن
بمحراب مسجد رخ آرائے دیر　　　بہ اندیش خویش و دعا گوئے خیر
تو گوئی ز بس دل ز دشمن رُباست　　　کہ سنگ درش سنگ آہن رباست

مرزا غالبؔ کے بعد فارسی زبان کے اداشناسوں کی نظر خواجہ عزیز الدین عزیزؔ لکھنوی پر پڑی جو اساتذۂ متقدمین کے جانشین اور دولت ادب فارسی کے آخری امین تھے، حاضرین محفل نے ان سے کچھ ارمغان نعت پیش کرنے کی فرمائش اور مرزا غالبؔ نے خود سفارش کی، انھوں نے اپنے قصیدۂ نعتیہ کے چند شعر پڑھے اور لوگوں نے توجہ سے سنا۔

می رسد در گوش بس از دشت و دربانگ جرس　　　می روم از خود کہ بنود تیز رو تر زیں فرس
اللہ اللہ می روم راہے کہ باشد بے خطر　　　نے غمے از رہزناں نے گیر و دارے از عسس
چوں جبل دشت و جبل از شوق می آید برقص　　　خامہ در راہِ حجاز از باشد آہنگ جرس

ذوق شیریں کام باشد تو شۂ منزل نورد | شوق بے پروا خرام آمد رفیق زود رس
می رسانم خویش را تا روضۂ سلطانِ دیں | چوں نسیم صبح ایں رہ طے کنم در یک نفس
شہسوار منزل اسریٰ کہ رفتی ہمرکاب | طرقوا گو جبرئیل از پیش و اسرافیل پس
مرکبش با برگ و ساز و منزلش دور و دراز | مرکبش بس راہوار و راہ پاک از خار و خس
رفت از ہر پایۂ بالا تر و ہم پیشتر | ہمچو نقش پا ز حیرت ہر دو عالم ماند پس
شد جدا آخر ز تن بارفت تنہا زاں مقام | سر تہی از ہر خیال و دل تہی از ہر ہوس
جذبۂ شوق الٰہی آستین او گرفت | بر دتا جائے کہ آنجا ئے نگنجد پیش و پس
میزبانی آں چناں و میہمانی ایں چنیں | سیر شد چوں یافت برخوان بادی دسترس

خواجہ عزیز لکھنوی کا نام آتے ہی لوگوں کی نگاہیں منشی ولایت علی خاں عزیز صفی پوری[1] پر پڑیں جو کہن سال و کہنہ مشق فارسی شاعر اور صاحب مسند و سجادہ شیخ ہونے کے باوجود غایت تواضع و فرط ادب سے حاضرین محفل میں اس طرح چھپے اور دبے بیٹھے تھے کہ مشکل سے کسی کی نظران پر پڑتی خواجہ عزیز اور خود ان کے استاد مرزا غالب نے اس فرمائش کی تائید کی اور ان کا کلام جس سے نعتیہ محفلیں گرم رہا کرتی ہیں، سننے کا اشتیاق ظاہر کیا، خوش آواز و زمزمہ پرواز پڑھنے والے نے جب ان کی نعتیہ غزل پڑھ کر سنائی جو خیالات کی نزاکت و بلندی کے ساتھ ترنم و موسیقیت بحر کی لطافت اور الفاظ کے حسن و موزونیت سے بھی معمور تھی تو ساری محفل کیف و مستی سے سرشار ہو گئی اور ایک سماں سا بندھ گیا، ایرانی شعراء نے بھی بے اختیار داد دی اور ان کی فارسی زبان دانی اور قادر الکلامی کا دل کھول کر اعتراف کیا، بہت سے اہل دل نے یہ محسوس کیا کہ یہ غزل سارے مشاعرے پر چھا گئی اور قلب و گوش میں سما گئی۔

---

[1] وفات ۱۳ محرم ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء۔

گشتِ بے تیغم بعشوہ ترک[1] نازک پیکرے ‏‏‏— خوش بیانے مہربانے جان جانے دل برے

یاسمن رشکِ سمن جانِ چمن یا جانِ من ‏— آشنائے دل ربائے خود نمائے خود سرے

کفر سوزے دل فروزے خوبرو آہستہ خو ‏— پاک دینے پاک بینے خوشتر از ہر خوشترے

نازنینے مہ جبینے دل کشئے بے دل کشے ‏— جاں گدازے دل نوازے گوہرے یا اخترے

سادۂ آزادۂ مستانۂ جانانۂ ‏— مست چشمے دیدہ شیخے طرفہ زیبا منظرے

بے قرارم اشک بارم سخت زارم اے عزیز ‏— دل برو جاں آورد ہر دم بطرزِ دیگرے

حضرت عزیز کے بعد واقفِ حال حاضرین نے حضرت محوی[2] فتحپوری سے اپنی کوئی فارسی نعت سنانے کی فرمائش کی کہ انھوں نے بھی اس دورِ اخیر میں اپنی فارسی دانی، صحت و صفائی زبان اور ایرانی شعراء کی کامیاب تقلید و تتبع کا سکہ بٹھا دیا ہے، وہ کچھ تامل کے بعد مسند پر آئے اور انھوں نے اپنی نعتیہ غزل پڑھی اور ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدا بلند ہوئی اور اس میں خوش آہنگی اور احتیاط کے ساتھ ایرانی شعراء کی آواز بھی شامل تھی۔

فطرت بجلوہ آمد و کارِ بہار کرد ‏— از شرق تا بہ غرب زمیں لالہ زار کرد

بیدار کرد سبزۂ خوابیدہ را ہزار ‏— بانگ نماز صبح چو از شاخسار کرد

تمجید کرد فاختہ لرزید شاخسار ‏— تکبیر گفت کبک فغاں کوہسار کرد

آمد بروں ز پردۂ تقدیس شاہدے ‏— کز بہر او زمانہ لبے انتظار کرد

---

[1] ترک فارسی شعراء کے یہاں حسین یا محبوب کے معنی میں آتا ہے، امیر خسرو کا مصرع ہے۔ ع

جملہ ترکانِ جہاں ہندوئے تو

[2] مولوی مسعود علی محوی بی اے علیگ، قصبہ فتحپور ضلع بارہ بنکی میں ولادت ہوئی، دار الترجمہ حیدر آباد سے تعلق معاش تھا، حیدر آباد ہی میں وفات پائی۔

مسکیں بعالم آمد و مسکیں بخلق زیست | مسکیں صفت زعالم فانی گذار کرد
آں کاملے کہ از نظر کیمیا اثر | خاک سیاہ را زر کامل عیار کرد
آں سرورے کہ بے مددِ لشکر و سپاہ | آوارگان بادیہ را شہریار کرد
بنمود چہرہ ظلمت شب گشت یک طرف | افشاند زلف بزم جہاں مشکبار کرد
با دوستاں نمود وفا جاں نثار ساخت | بر دشمناں فزود کرم شرمسار کرد
با ہر کہ بست عقد ولا استوار بست | با ہر کہ کرد عہد وفا پائدار کرد
گویم چرا نہ صاف کہ در قید آب و گل | بر خلق جلوہ رحمت پروردگار کرد
می خواست شوق سلسلۂ مدح را دراز | آمد ادب اشارہ بسے اختصار کرد

محوی دریں دیار غریب است و دل فگار
باید نظر بحال چنیں دل فگار کرد

محوی صاحب کے بعد لوگوں نے فارسی کے مشہور شاعر استاد نظام دکن شیخ غلام قادر گرامی سے فرمائش کی اور انھوں نے حسب ذیل اشعار پڑھے۔

ایں چہ شوخیست ویں چہ بے ادبی | من و نعتِ محمدؐ عربی
دُر یکتائے دُرجِ مطلبی | سید ما محمدؐ عربی
من و ایں نشہ آں دماغ کجا | من و ایں بادہ آں ایاغ کجا
نازشِ کارگاہِ ارض و سپہر | حلقہ در گوش او چہ ذرہ چہ مہر
شعلۂ نور و موسیٰؑ و سرِ طور | احمدؐ از فرق تا قدم ہمہ نور
زدہ یونسؑ بہ بطن حوت قدم | زد محمدؐ بہ جدی و حوت علم
زکریاؑ بہ ارّہ گشت دو نیم | خواجۂ را دل بذکرِ ارّہ سلیم

با سلیماں ز تخت باد دلیل | تخت احمدؐ ز شہپر جبریلؑ
پورِ مریمؑ کہ خود نماند بسے | مردہ را زندہ کرد از نفسے
خواجہؐ ما حبیب خاص خدائے | گمرہاں را بشرع راہ نمائے
رہِ توحید را بسر پویاں | اُمی حرف اُمتی گویاں
مردہ را زندۂ احدی کرد | زندہ را زندۂ ابدی کرد
یوسف از چاہ گر بماہ رسید | خواجہؐ زانگشت جیب ماہ درید
نوح شد ناخدائے کشتیٔ خویش | مرہمے چند بست بر دلِ ریش
علم افراز عرصۂ افلاک | جلوہ افروز کرسیٔ لولاک

ایران وہندوستان کے ان مستند شعراء اور اساتذۂ فن کے بعد سب کی نگاہیں اقبالؔ کی طرف اٹھیں جن کے نعتیہ اشعار اور جن کے عشق رسولؐ نے نہ صرف ایران وافغانستان اور برعظیم ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام کو حرارتِ عشق اور کیف ومستی سے بھر دیا ہے، اور جنھوں نے نعت میں بھی اپنی نئی روش نکالی ہے، اور اس کے اندر بھی احیاء وانقلاب کا سامان پیدا کر دیا، انھوں نے سب سے پہلے اپنی مثنوی "اسرار خودی" کے چند منتخب اشعار پڑھے جن میں انھوں نے سیرت نبویؐ کا عطر کھینچ لیا ہے اور دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے، انھوں نے جب اپنے پُرسوز مگر پُر از اعتماد لہجہ میں یہ اشعار پڑھے تو محفل پر ایک بے خودی سی طاری ہو گئی۔

دردلِ مسلم مقام مصطفےٰ است | آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
بوریا ممنون خوابِ راحتش | تاج کسریٰ زیرپائے امتش
در شبستان حرا خلوت گزید | قوم وآئین وحکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم | تا بہ تخت خسروی خوابید قوم

وقت ہیجا تیغ او آہن گداز — دیدۂ اُو اشکبار اندر نماز

در دعائے نصرت آمین تیغ او — قاطع نسل سلاطیں تیغ اُو

در جہاں آئین نو آغاز کرد — مسند اقوام پیشیں درنورد

از کلید دیں درِ دنیا کشاد — ہمچو او بطن اُم گیتی نزاد

چاروں طرف تحسین کا شور ہوا، صاحب ذوق حاضرین نے ان کی مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد" میں سے وہ اشعار سنانے کی فرمائش کی جو انھوں نے حضور رسالت مآبؐ میں پیش کئے ہیں، انھوں نے بڑے درد و سوز کے ساتھ یہ شعر پڑھے جس میں ہدیۂ سپاس بھی تھا، خراج عقیدت بھی، نذرانۂ غلامی بھی اور موجودہ عالم اسلام کی سچی تصویر بھی، انھوں نے نبی عربی صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ ناقابل فراموش احسانات یاد دلائے جو ان سارے انسانوں کی گردن پر ہیں، جنھوں نے آپ کے ذریعہ ایمان و توحید کی دولت اور ہدایت و نجات کا راستہ پایا ہے، اور اپنے سے حقیر و کمزور ہستیوں کے سامنے سربسجود ہونے اور جوہر انسانیت کی تذلیل کرنے سے باز آئے تھے، غلامی و بندگی کی ہر نوع و شکل سے نجات پائی ہے، وہ چونکہ ہندی الاصل[1] ہیں اور ان کے اسلاف کچھ عرصے پہلے مشرف باسلام ہوئے تھے، اس لئے ان کا اس پر شکر کرنا بڑا معنی خیز اور اثر انگیز ہے کہ انھوں نے محمد رسول اللہ ہی کے طفیل گاؤخوری کی پرستش، پروہتوں دینی پیشواؤں اور خود ساختہ خداؤں کی بندگی سے نجات پائی۔

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ — وارہا ایں قوم را از ترس مرگ

سوختی لات و منات کہنہ را — تازہ کردی کائنات کہنہ را

---

[1] وہ ایک فلسفہ زدہ سید زادہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میں اصل کا خاص سومناتی — آبا میرے لاتی و مناتی

تو سید ہاشمی کی اولاد — میری کف خاک برہمن زاد

درجہان ذکر و فکر انس و جاں | تو صلوٰۃ صبح، تو بانگ اذاں
لذت سوز و سرور از لا الٰہ | در شب اندیشہ نور از لا الٰہ
نے خدا ہا ساختیم از گاؤ و خر | نے حضور کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیش معبودان پیر | نے طواف کوشک سلطان و میر
ایں ہمہ از لطف بے پایان تست | فکر ما پروردۂ احسان تست
ذکر تو سرمایۂ ذوق و سرور | قوم را دارد بہ فقر اندر غیور
اے مقام و منزل ہر راہ رو | جذب تو اندر دل ہر راہ رو
ساز ما بے صوت گردید آنچناں | زخمہ بر رگہائے او آید گراں
در عجم گردیدم و ہم در عرب | مصطفےٰ نایاب و ارزاں بولہب

وہ جب مندرجہ ذیل اشعار پر پہونچے اور انھوں نے یہ بتاتے ہوئے کہ میری زندگی کا سرمایہ اور میری دنیا آپؐ ہی کی محبت اور آپؐ ہی کا علم و عرفان ہے، یہ کہا کہ آپ کے سوا مجھ آوارہ و ناکارہ کا کوئی خریدار اور مجھ آہوئے زار و نزار کا کوئی صیاد نہیں، میں سب سے ناامید ہو کر بڑی امید سے آپؐ کے قدموں میں آیا ہوں تو سننے والے تڑپ اٹھے اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

شہسوارا یک نفس درکش عناں | حرف من آساں نیاید بر زباں
آرزو آید کہ ناید تا بہ لب؟ | می نہ گردد شوق محکوم ادب
آں بگوید لب کشا اے دردمند | ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند
گرد تو گردد حریم کائنات | از تو خواہم یک نگاہ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی | کشتی و دریا و طوفانم توئی
آہوئے زار و زبون و ناتواں | کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہِ من حریم کوئے تو　　من بامیدے رمیدم سوئے تو

پھر جب انھوں نے یہ کہا کہ اپنی ناکارگی کے باوجود مجھ سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، علم میں بے مایہ ہوں، لیکن بداصل وبدگوہر نہیں، گنہگار و کوتاہ عمل ہوں، حقیقت ناشناس اور احسان فراموش نہیں، تہی دست و بے حاصل ہوں مگر ایک چیز رکھتا ہوں جس کا نام دل ہے، اس دل کو آپؐ کے قدموں کے نیچے پامال ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، اور آپؐ کے رہوار رعنا کا نقشِ پا اب بھی اس کے لوح پر نگیں اور اس کی عزیز ترین متاع ہے۔

مومنم از خویشتن کافر نیم　　بر فسانم زن کہ بد گوہر نیم

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است　　چیزکے دارم کہ نام او دل است

دارمش پوشیدہ از چشم جہاں　　کز سمِ شبدیزِ تو دارد نشاں

پھر انھوں نے اس بے نظیر نظم و مناجات کو ان دعائیہ اشعار پر ختم کیا اور تمام حاضرین نے ان کی اور اپنی طرف سے آمین کہی۔

اے کہ دادی کُرد را سوزِ عرب　　بندۂ خود را حضورِ خود طلب

بندۂ چوں لالہ داغے در جگر　　دوستانش از غمِ او بے خبر

بندۂ اندر جہاں نالاں چو نے　　تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے

در بیاباں مثلِ چوبِ نیم سوز　　کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز

اقبالؔ پر فارسی کا دور ختم ہوا اور ان کے بعد کسی کو نہ فارسی میں کچھ سنانے کی جرأت ہوئی نہ حاضرین نے فرمائش کی۔

اُردو شعراء کی نذرِ عقیدت

فارسی شعراء کے بعد اب شعرائے اردو کی باری آئی، بے اختیار نگاہیں اُٹھ گئیں اور لوگ گوش برآواز ہوکر بیٹھ گئے، نعت گوئی، عشقِ رسول ؐ اور شوقِ مدینہ ہندوستانی شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے، فارسی شاعری کے بعد سب سے بہتر اور سب سے موثر نعتیں اردو ہی میں ملتی ہیں، عشقِ رسولؐ اور سرزمین حجاز سے گہری وابستگی اور شیفتگی، ہندوستانی اسلامی ملت کے مزاج و عناصر ترکیبی میں شامل ہوگئی، اسی کی بدولت اس نے آٹھ سو برس تک اپنے جوہر کی حفاظت کی اور اسی کی وجہ سے قوم پرستی یا وطن پرستی کی غالی تحریکیں یا لادینیت کا سیلاب کبھی اس کو خس و خاشاک کی طرح بہا نہیں سکا، نبی عربی صلے اللہ علیہ وسلم اور حجاز مقدس سے اُس نے اپنے تعلق و ارادت کا اس طرح اظہار کیا ہے کہ قوم پرستی کے پرجوش علمبرداروں نے بعض اوقات اس کو اس کا طعنہ دیا ہے کہ اس ملت کا جسم سرزمین ہند میں رہتا ہے اور اس کا دل و روح سرزمین حجاز میں، اور یہ یہاں پیدا ہونے اور یہیں مرنے کے باوجود ہمیشہ مدینہ کی گلیوں ہی کا خواب دیکھتی رہتی ہے، اور زبانِ قال یا زبانِ حال سے ہمیشہ یہی صدا بلند کرتی رہتی ہے کہ ــــــ

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

ہندی مسلمانوں کا سرزمین حجاز سے عموماً اور خاکِ یثرب سے خصوصاً ایسا گہرا تعلق اور

روحانی عشق ہے کہ ان کو وہاں مرنے کی آرزو اور وہاں کی زمین میں دفن ہونے کی تمنا رہتی ہے، انیسویں صدی عیسوی کے ایک مشہور اردو شاعر کرامت علی شہیدیؒ (متوفی ۱۲۵۶ھ) نے یہاں تک تمنا کی ہے کہ اگر ان کی لاش وہاں کی پاک سرزمین میں دفن ہونے کے قابل نہ ہو تو اس کے صحرا کے جانوروں ہی کا لقمہ بن جاتی، ان کے اس قصیدہ کے دو مشہور شعر ہیں ؎

مدینہ کی زمیں کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ — کسی صحرا میں وہ ان کے طعمہ ہوں میں دام[1] او ر دد کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے — قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا[2]

محفل کا افتتاح ہوا تو سب سے پہلے حضرت امیر مینائی کو جگہ دی گئی ان کی نعت کے یہ شعر جن میں واقعہ نگاری، اہلِ زبان کی فصاحت، محاورات کے لطف کے ساتھ خاص ترنم اور بحر کی موزونیت بھی تھی، پڑھے گئے، تو سماں بندھ گیا اور ساری محفل کیف ہو گئی ــــــــــــ

خلق کے سرور، شافعِ محشر، صلے اللہ علیہ وسلم — مرسلِ داور، خاص پیمبر، صلے اللہ علیہ وسلم

نورِ مجسم، نیرِ اعظم، سرورِ عالم، مونسِ آدمؑ — نوحؑ کے ہمدم، خضر کے رہبر، صلے اللہ علیہ وسلم

دولتِ دنیا خاک برابر، ہاتھ کے خالی دل کے تونگر — مالکِ کشور، تخت نہ افسر، صلے اللہ علیہ وسلم

چشمۂ جاری، خاصۂ باری، گردسواری، بادِ بہاری — آئینہ داری، فخرِ سکندر، صلے اللہ علیہ وسلم

مہر سے مملو ریشہ ریشہ نعت امیر اپنا ہے پیشہ — وردِ ہمیشہ دن بھر شب بھر صلے اللہ علیہ وسلم

امیر مینائیؒ کے بعد ان کے معاصر اور اردو کے نامور نعت گو حضرت محسن کاکوروی کی باری آئی جنھوں نے اپنی ساری زندگی، ذہانت و علمیت اور ادبی صلاحیتیں نعت گوئی کے لئے وقف

---

[1] دام اور دد یعنی جانور اور درندہ [2] شہیدی کی یہ تمنا پوری ہوئی، مصنف "گلِ رعنا" لکھتے ہیں ۱۲۵۵ھ میں حج و زیارت کے ارادہ سے گھر سے نکلے، اس سال فریضۂ حج ادا کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے کہ راستہ میں بیمار پڑ گئے ۴ر صفر ۱۲۵۶ھ کو جس وقت تمام منزلیں طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہونچے جہاں سے روضۂ مطہرہ نظر آتا تھا، ایک حسرت ناک نظر اس پر ڈالی اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

کردی تھیں یہاں تک کہ مشہور ہے کہ داہنے ہاتھ سے جس وقت وہ نعت لکھتے تھے، دنیا کی کوئی اور چیز لکھنا پسند نہیں کرتے تھے، حاضرین نے ادب سے عرض کیا کہ حضرت کا کلام صنائع بدائع اور تلمیحات سے ایسا پُر ہوتا ہے کہ تبحر علماء اور دقیق النظر ادیبوں کے سوا کوئی پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا اس لئے کوئی ایسا قطعہ پڑھا جائے جو زبان کے لطف اور محاورات کی چاشنی کے ساتھ پورے طور پر ہماری سمجھ میں آجائے۔

حضرت محسنؔ نے وہ اشعار پڑھے جن میں جبرئیل امینؑ کے آنے، آپ کو بیدار کرنے اور براق پر سوار کر کے معراج میں لے جانے کا نقشہ کھینچا ہے، حاضرین محفل زبان کے لطف اور قدرت بیان سے بہت ہی محظوظ ہوئے۔

آداب سے آپ کو اٹھایا ... یا اپنے نصیب کو جگایا
بیدار ہوئی جو چشم حق بیں ... آہو ہوئی شکل خواب شیریں
دیکھا کہ عجیب ماجرا ہے ... گھر برج قمر بنا ہوا ہے
انشائے رموز غیب مخبر ... ہونے کا نہیں یہ دن کبھی پھر
سونا کبھی ہو نہ ہو جگانا ... لیتا رہے کروٹیں زمانہ
طالع میں نہیں یہ شب کسی کے ... اختر سو بار سو کے جاگے
ہوگی نہ یہ پھر زمیں کی توقیر ... مٹی ہو ہزار بار اکسیر
انوار کا ہے ورود پیہم ... تاروں کی برس رہی ہے شبنم
جبریلؑ ہیں اور براق بھی ہے ... قاصد بھی ہے، اشتیاق بھی ہے

مولانا محسنؔ کے بعد خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی باری آئی جن کا مسدس بچہ بچہ کی زبان پر ہے، حاضرین نے عرض کیا کہ اگرچہ مسدس کے نعتیہ اشعار ہزار بار سنے ہیں، لیکن پھر ایک بار

سننا چاہتے ہیں کہ ان کی سادگی میں غضب کی تاثیر اور اس شاعری میں واقعات اور حقائق کی سچی تصویر ہے، یہ فرمائش پوری کی گئی اور مسدس کے ان مشہور اشعار سے محفل جھوم اٹھی ــــــــ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مِس خام کو جس نے کندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا
پڑی کان میں دھات تھی اک نکمّی نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اس کے جوہر تھے اصلی ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی
یہ تھا ثبت علم قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

مولانا حالی کے بعد ایک نوجوان شاعر مسند کی طرف بڑھا، اپنے لباس اور شکل و صورت میں

وہ پنجاب کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا لیکن مولانا حالی نے اس نوجوان کا استقبال نوجوانوں سے بڑھ کر کیا[1]، اور اس کو محبت و توقیر کے ساتھ بٹھایا، محفل کے بعض گوشوں میں یہ بات کہی گئی کہ یہ اردو کا سب سے بڑا نعت گو شاعر ہے، اور اس کے کلام سے بڑھ کر کسی نعت میں الفاظ کا شکوہ اور بندش کی چستی نہیں ملتی، یہ ظفر علی خاں (ملیگ) تھے، پہلے تو لوگوں نے ان سے ان کی اس نظم کے سننے کی فرمائش کی جو ان کے ابتدائی زمانہ کا کلام ہے لیکن مدتوں اس سے اسلامی مدارس و محافل کا افتتاح کیا جاتا رہا ہے۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں   اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو   یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا   وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے   ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ   ہم مرتبہ ہیں یاران نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

جب یہ نظم ختم ہوئی تو حاضرین نے ان سے ایک دوسری نعت کی فرمائش کی اور وہ اس طرح نغمہ سرا ہوئے۔

اے کہ ترا جمال ہے زینت محفلِ حیات   دونوں جہاں کی رونقیں ہیں ترے حسن کی زکوٰۃ
تیری جبیں سے آشکار پرتو ذات کا فروغ   اور ترے کوچہ کا غبار سرمۂ چشم کائنات
بارگہ الست سے بخش دیئے گئے تجھے   سب ملکی تصرفات، سب فلکی تجلیات

---

[1] مولانا حالی نے ظفر علی خاں کی مدح میں نظم لکھی ہے جو بہارستان کے مجموعہ کے آغاز میں ہے جس کے آخری دو شعر ہیں۔

پنجاب کو اگر ہو تجھ پر فخر   ہے اس کو فخر و ناز شایاں
زندہ ہے وہ ملک اور ملت   ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

چہرہ کشا کرم ترا قاف سے تا بہ قیرواں — لطف ترا کرشمہ سنج کعبہ سے تا بہ سومنات

تیرے سلام کے لئے گلشنِ قدس کے طیور — گھوم رہے ہیں ڈال ڈال جھوم رہے ہیں پات پات

دیکھتے ہی ترا جلال کفر کی صف اُلٹ گئی — جھک گئی گردنِ ہبل ٹوٹ گیا طلسم لات

آنکھ کے اک اشارہ سے تو نے مٹا بدل دیئے — ذہن کے سب تصورات قلب کے سب تاثرات

چون و چگونہ و چرا تا بکجا و تا بکے — حل کئے ایک بات میں تو نے یہ سرمدی نکات

غیر کو خویش کر دیا نیش میں نوش بھر دیا — پل میں درست کر دیے بگڑے ہوئے تعلقات

کیا ہی وہ انقلاب تھا ڈھل گئے جس میں ایک ساتھ — لزبن و پیرس و دمشق پیکن و دہلی و ہرات

از سرِ نو کیا گیا دودۂ آدم ارجمند — اٹھ گئی قیدِ خون و رنگ مٹ گیا فرق نسل و ذات

شانِ خدائے پاک تھی تیرے بیوں کی سادگی — جس پہ نثار ہو گئے سب عجمی تکلفات

تیری ثنا میں تر زباں ہو گیا جو مری طرح — اس کے قلم میں آ گئی شانِ روانی فرات

پست و بلند کے لئے عام ہیں تیری رحمتیں — عرش سے اور فرش سے تجھ پہ سلام اور صلوٰۃ

اے کہ رواں رواں ترا درد میں ہے بسا ہوا — کس کو ترے سوا سنائیں جا کے ہم اپنی مشکلات

سر پہ اندھیری رات ہے گھر گئی ہے بھنور میں ناؤ — موجِ بلا ہے تاک میں دور ہے ساحلِ نجات

تھام کے پایہ عرش کا کر بہ ادب یہ التجا — اے کہ ہے مبدءِ فیوض ایک فقط تری ہی ذات

بندے بھلے ہوں یا برے تو تو ہے اے خدا کریم — قطع ہو کیوں کریم کا سلسلۂ نوازشات

موردِ لطفِ خاص پر کس لئے آج یہ عتاب — ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات!

ظفر علی خاں کے کلام کی برجستگی، فارسی بندش کی چستی اور شکوہِ الفاظ کو سن کر حاضرینِ محفل کو بے اختیار اقبال احمد خاں سہیل یاد آ گئے، ان دونوں کو ایک ہی درسگاہ[1] سے نسبت اور ایک ہی استاد[2] سے

[1] علی گڑھ کالج۔ [2] مولانا شبلی نعمانی مرحوم۔

تلمذ تھا، اور دونوں نے ان سے فارسی کے مذاقِ سلیم کی وراثت پائی تھی، حاضرین نے ان سے ان کے مشہور قصیدۂ نعتیہ کہ جس کا مطلع ہے ــــــــــــ

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعی امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاک گریبانی

کے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی، انھوں نے حسب ذیل شعر پڑھے اور سخن شناس حاضرینِ محفل نے پرجوش داد دی۔

محمدؐ یعنی وہ حرفِ نخستیں کلکِ فطرت کا ۔۔۔ محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعات ربانی
وہ فاتح جس کا پرچم اطلس زنگاری گردوں ۔۔۔ وہ اُمی جس کے آگے عقلِ کل، طفلِ دبستانی
وہ رابط عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے ۔۔۔ وہ فارق، زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی
وہ ناطق، جس کے آگے مہر بر لب بلبلِ سدرہ ۔۔۔ وہ صادق، جس کی حق گوئی کا شاہد نطق ربانی
وہ عادل جس کی میزانِ عدالت میں برابر ہے ۔۔۔ غبارِ مسکنت ہو، یا وقارِ تاج سلطانی
وہ جامع، جس نے یکجا کر دیے بکھرے ہوے دانے ۔۔۔ مٹا دی جس نے آکر باہمی تفریقِ انسانی
وہ گنجورِ معارف جس کے اک اک حرف میں پنہاں ۔۔۔ نکات فلسفی، اسرارِ نفسی، رازِ عمرانی
وہ کشاف سرائر جس نے کھولا چند اشاروں میں ۔۔۔ علوم اولین و آخریں کا گنج پنہانی

حاضرین نے ان سے ان کی مشہور نظم "موجِ کوثر" کے بھی چند اشعار پڑھنے کی فرمائش کی، امیر مینائی اور مولانا ظفر علی خاں نے بھی جنھوں نے اسی بحر و ردیف و قافیہ میں نظم لکھی ہے تائید کی، انھوں نے حسب ذیل اشعار پڑھے اور ساری محفل درود "صلے اللہ علیہ وسلم" کی صدا سے گونج اٹھی۔

احمد مرسل، فخر دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ مظہر اول، مرسل خاتم، صلے اللہ علیہ وسلم
جسم مزکّٰی روح مصوّر قلب مجلّٰی نور مقطر ۔۔۔ حسن سراپا، خیر مجسم، صلے اللہ علیہ وسلم

کفر کی ظلمت جس نے مٹائی، دین کی دولت جس نے لٹائی — لہرایا توحید کا پرچم صلے اللہ علیہ وسلم
باغ جہاں کا حارس نامی جس نے مٹائی رسم غلامی — پھر سے سنوارا گلشنِ آدم صلے اللہ علیہ وسلم
بزم ملل تھی نظم سے خالی، بکھرے ہوئے تھے حق کے لآلی — اس نے کئے سب آ کے منظم صلے اللہ علیہ وسلم
وہم کی ہر زنجیر کو توڑا، رشتہ ایک خدا سے جوڑا — شرک کی محفل کر دی برہم صلے اللہ علیہ وسلم
فرد و جماعت، امر و اطاعت، کسب و قناعت، عفو و شجاعت — حل کئے جو اسرار تھے مبہم صلے اللہ علیہ وسلم
ربط و تصادم، طوع و تحکم، فقر و تنعم، عدل و ترحم — سب کے حدود بتائے باہم صلے اللہ علیہ وسلم
حفظِ مراتب، پاس اخوت، سعی و توکل، رفق و فتوت — تلک حدود اللہ میں منضم صلے اللہ علیہ وسلم
ارض و سما میں آئینۂ رحمت، روزِ جزا میں سایۂ رحمت — اس کے لوائے حمد کا پرچم صلے اللہ علیہ وسلم
راہ میں کانٹے جس نے بچھائے، گالی دی پتھر برسائے — اس پر چھڑکی پیار کی شبنم صلے اللہ علیہ وسلم
فقر و غنا دونوں کا سلطاں، روح و جسد دونوں کا درماں — دین کا اور دنیا کا سنگم صلے اللہ علیہ وسلم

حاضرین مجلس نے حضرت امجد حیدرآبادی سے کچھ سنانے کی فرمائش کی، جو لوگ اُن کا کلام سن چکے تھے، انھوں نے اس نظم کے (جس میں سفرِ ہجرت کا نقشہ کھینچا ہے اور امجد نے سادگی و پرکاری کا ایک نمونہ پیش کیا ہے) کچھ پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، امجد نے حسب ذیل اشعار سنائے۔

چلی صحنِ کعبہ سے بادِ بہاری — مدینہ کو جاتی ہے گُل کی سواری
ہوئی رخصت رحمتِ ربِّ باری — ہر اک غم میں کرتا ہے فریاد و زاری
کوئی کہہ رہا ہے جگر کو سنبھالے — اِدھر دیکھ لینا اُدھر جانے والے
ہے دریائے خوں چشمِ زمزم سے جاری — سوادِ حرم میں ہے اک سوگواری
ہر اک دل میں ہے برق سی بے قراری — ہر اک کی صدا ہے کہ سن لے ہماری
نہ جا ہم سے منھ موڑ کر جانے والے — یہاں کون ہم بیکسوں کو سنبھالے

صفا مروہ کا دل ہوا پارہ پارہ وہ بجلی گری پھٹ گیا سنگِ خارا
ہوا غم سے کعبہ سیہ پوش سارا تڑپ کر یہ غارِ حرا نے پکارا
کہاں تو چلا میرے نازوں کے پالے پھر آ میری آغوش میں جانے والے

لوگوں کی نظر حفیظ جالندھری پر پڑی، حاضرین محفل نے شاہنامۂ اسلام کا سلام سنانے کی فرمائش کی، جو مقبول خاص و عام ہے، حفیظ نے یہ چند اشعار اپنے دلکش و پرسوز لہجہ میں پڑھے اور محفل میں سماں بندھ گیا۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے ظلِّ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی
سلام اے سرِّ وحدت اے سراجِ بزمِ ایمانی
زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی
ترے آنے سے رونق آگئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربّانی
سلام اے صاحبِ خلقِ عظیم انساں کو سکھلائے
یہی اعمالِ پاکیزہ، یہی اشغالِ روحانی
تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی
اگرچہ فقر فخری رُتبہ ہے تیری قناعت کا
مگر قدموں تلے ہے فرِّ کسرائی و خاقانی

زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے
ترے پرتو سے مِل جائے ہر اک ذرہ کو تابانی
حفیظؔ بے نوا بھی ہے گدائے دامنِ دولت
عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی
ترا در ہو، مرا سر ہو، مرا دل ہو، ترا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی
سلام اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

حفیظؔ کے بعد نگاہیں ماہرؔ القادری صاحب کی طرف اٹھیں اور لوگوں نے ان سے ان کی مشہور و مقبول نعتیہ نظم سنانے کی فرمائش کی جس میں بڑی خوبی کے ساتھ محسنِ عالم کے عالمگیر احسانات اور بعثت محمدی کی انقلاب انگیزی کی تصویر کھینچی گئی ہے جس میں زورِ شاعری اور حُسن بیان کے ساتھ کہیں واقعیت و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے، ماہرؔ صاحب نے فرمائش کی تعمیل کی اور حسب ذیل شعر پڑھے۔

کچھ کفر نے فتنے پھیلائے کچھ ظلم نے شعلے بھڑکائے
سینوں میں عداوت جاگ اٹھی انسان سے انساں ٹکرائے
پامال کیا برباد کیا کمزور کو طاقت والوں نے
جب ظلم و ستم حد سے گزرے تشریف محمدؐ لے آئے

رحمت کی گھٹائیں لہرائیں، دنیا کی امیدیں بر آئیں
اکرام و عطا کی بارش کی، اخلاق کے موتی برسائے
تہذیب کی شمعیں روشن کیں، اونٹوں کے چرانے والوں نے
کانٹوں کو گلوں کی قیمت دی، ذروں کے مقدر چمکائے
اللہ سے رشتہ کو جوڑا، باطل کے طلسموں کو توڑا
خود وقت کے دھارے کو موڑا، طوفاں میں سفینے تیرائے
تلوار بھی دی، قرآں بھی دیا، دنیا بھی عطا کی عقبیٰ بھی
مرنے کو شہادت فرمایا جینے کے طریقے سمجھائے
مکہ کی زمیں اور عرش کہاں دم بھر میں کہاں پل بھر میں کہاں
پتھر کو عطا کی گویائی اور چاند کے ٹکڑے فرمائے
مظلوموں کی فریاد سنی، مجبوروں کی غم خواری کی
زخموں پہ خنک مرہم رکھے، بے چین دلوں کے کام آئے
عورت کو حیا کی چادر دی غیرت کا غازہ بھی بخشا
شیشوں میں نزاکت پیدا کی کردار کے جوہر چمکائے
توحید کا دھارا رک نہ سکا اسلام کا پرچم جھک نہ سکا
کفار بہت کچھ جھنجلائے، شیطاں نے ہزاروں بل کھائے
اے نام محمد صلِّ علیٰ ماہر کے لئے تو سب کچھ ہے
ہونٹوں پہ تبسم بھی آیا آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے

ان منتخب نعتوں سے جو چیدہ و برگزیدہ شعراء کی زبان سے سنی گئیں قدرتی طور پر حاضرین کو

صاحب مدینہ کے ساتھ مدینہ کی یاد آئی، جو وہاں حاضر ہو چکے تھے، ان کے زخم کہن تازہ ہوئے جن کو ابھی تک یہ سعادت نہیں حاصل ہوئی تھی، ان کے اندر وہاں کی حاضری کی آرزو نے دل میں چٹکیاں لیں، اس موقع پر لوگوں کی نگاہ حمید صدیقی صاحب پر پڑی جو بار بار حاضری کی وجہ سے اور وہاں کی حاضری کی روداد بار بار سنانے کی وجہ سے "زائر حرم" ہی کے نام سے مشہور تھے، لوگوں نے ان سے اپنی کوئی ایسی نظم سنانے کی فرمائش کی جس میں وہاں کی حاضری کی کیفیات اور جدائی کے تاثرات بیان کئے گئے ہوں، لوگوں کے اصرار سے وہ مسند پر آئے اور اپنے دل کش اور پرسوز لہجہ میں اپنی یہ نظم پڑھی۔

وہ عجیب وقت تھا جب چلے تھے دیار نکہت و نور سے
وہ عجب سماں تھا جدا ہوئے تھے جو آستانِ حضور سے
بصد اضطراب درود پڑھنا مرا وہ کیف و سرور سے
کبھی جالیوں کے قریب سے کبھی ہٹ کے سامنے دور سے
وہ نظر نواز تجلیاں وہ سکوت دل وہ سکونِ جاں
یہ کسے مجال ملا سکے جو نظر کو پردۂ نور سے
وہ خنک نسیم وہ صبح دم، وہ اذاں کے نغموں کا زیر و بم
جسے دیکھئے وہ کھڑا ہے شوق میں محو ذکر حضور سے
کرم اور کرم کی وہ بارشیں، وہ عنایتیں وہ نوازشیں
جو کسی کو جلووں کی تابشیں، نظر آئیں حجلۂ نور سے
کبھی مجھ کو محو نہ کر سکے یہ رباب و چنگ کے زمزمے
کہ دل اپنا مست ہے باغ طیبہ کے نغمہ ہائے طیور سے

ہے مری نگاہ میں آج بھی وہ دل کشی شب ماہ کی
وہ فضا میں چھٹکی ہے چاندنی جو ضیائے قبہ نور سے
مجھے بیر غرس[1] کی چاہ ہے مری تشنگی ہی گواہ ہے
یہ وہ تشنگی نہیں تشنگی جو بجھے شراب طہور سے
جبل احد کے نظارہ کی ہے نگاہِ شوق کو آرزو
نہ خیال باغ نعیم کا، نہ ہے ذوق منظر طور سے
کبھی زائرین حرم اگر، سوئے دشت بدر بھی ہو گزر
تو سلام کہنا مری طرف سے وہاں کے اہلِ قبور سے
کہوں کس سے رازِ غمِ نہاں کہ ہے اشک آنکھوں سے کیوں رواں
وہ سکون قلب نہیں یہاں جو وہاں تھا قرب حضورؐ سے
جو تڑپ حمیدؔ ہے آج کل اسی دھن میں آئے مجھے اجل
مرے لب پہ ہوگی یہی غزل جو اٹھوں گا شور نشور سے

شورِ نشور کے لفظ سے حضرت نشورؔ واحدی یاد آئے اور چند لوگوں نے جنھوں نے ان کی نعت "کہنہ گلیے تازہ پیالے" سنی تھی فرمائش کی کہ وہ بھی اسٹیج پر آئیں اور شورِ نشورؔ سے اس محفل میں تازگی اور سرور پیدا کر دیں جو دیر سے باادب اور دو زانو بیٹھی ہوئی ہے نشورؔ صاحب نے اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ حسب ذیل نعت پڑھی:-

ذکر اس کا ہے اور با چشم پُرنم — نازاں ہے جس پر تاریخِ آدمؑ
ایمان مطلق ارشادِ محکم — نور مجسم، جانِ دو عالمؐ

[1] یہ کنواں مسجد قبا سے مشرقی جانب نصف میل کے فاصلے پر ہے۔

روحِ ہدایت احمدؐ بہ نامے
یثرب مقامے، بطحا خرامے

اُبھرا ہے جب سے ہستی کا تارا — طوفاں بکف ہے عالم ہی سارا
بے سود کشتی، چھوٹا کنارا — ختمِ رُسُل کا بس اک سہارا

ذاتِ رفیقش، خاصے بہ عامے
کہنہ گلیمے، تازہ پیامے

ہوتا نہیں گر فیضِ اَلَستی — دنیا اُجڑ کر شاید نہ بستی
ظلِّ نبی سے یہ نورِ ہستی — جس نے مٹائی باطل پرستی

مہتاب دستے، خورشید گامے
صُبحش چہ صبحے، شامش چہ شامے

نغمہ جنوں نے گایا نہیں تھا — رمزِ نبوت پایا نہیں تھا
خلوت میں کوئی آیا نہیں تھا — جلوہ تھا، لیکن سایا نہیں تھا

صدیقِ اکبرؓ قائم مقامے
دردینِ احمدؐ، اوّل امامے

خاموشیوں میں اعلانِ ایماں — کوئے طلب میں سروِ چراغاں
شمشیرِ عُریاں تدبیر رخشاں — تقویمِ عالم، قیّومِ دَوراں

فاروقِ اعظمؓ مردِ عوامے
حرفے جدیدے، نقشے دوامے

عثمانیت ہے غم کوش رہنا — صبر و رضا میں پُر جوش رہنا

جس نے سکھایا ذی ہوش رہنا　　خنجر کے نیچے خاموش رہنا

خوں در گلوُ قرآں بہ کامے

محوِ کلام و خود لاَ کلاَمے

جسمِ علیؓ میں تھی جانِ کامل　　علم و عمل کی اک شانِ کامل

ایمانِ کامل عرفانِ کامل　　نانِ جویں اور انسانِ کامل

جذبے عظیمے فکرے تمامے

طُوبیٰ بہ جیب و کوثر بہ جامے

پھر شمعِ ایماں ضَو پا رہی ہے　　بزمِ سیاست تھرّا رہی ہے

تاریخِ ماضی دُہرا رہی ہے　　کعبے کی جانب خلق آرہی ہے

منزل بہ منزل گامے بہ گامے

عالم مُسافر، کعبہ مقامے

آخر میں سامعین کے ذہن میں حضرت عزیز صفی پوری کی فارسی نعت تازہ ہوئی، جس کا مطلع ہے ؎

کشت بے تیغم بعشوہ ترک نازک پیکرے　　خوش بیانے مہربانے جان جانے دل برے

اس وقت ایک صاحبِ ذوق نے یاد دلایا کہ مولوی محمد ثانی حسنی صاحب نے اردو میں اس پر تضمین کی ہے،

اس پر اس مبارک محفل کا اختتام کیا جائے، شمع محمد ثانی صاحب کے سامنے آئی اور انھوں نے اپنی حسب ذیل تضمین سنائی۔

خاک کا یہ ذرہ ذکر مہوشاں کیسے کرے

عشق کے راز نہاں کو وہ عیاں کیسے کرے

مدح آقا کی گدائے بے نشاں کیسے کرے

مشک سے دھوئے زباں کو پھر بیاں ایسے کرے

کشتۂ بے تیغ مشفوہ ترک نازک پیکرے

خوش بیانے مہربانے جان جانے دل برے

نعت کہتا ہوں تری آقائے من شاہِ زمن
نام پیارا کتنا تیرا پاک تن پاکیزہ من
خندہ رو، روشن جبیں، غنچہ دہن شیریں سخن
نکہت زلف معنبر پر فدا مشک ختن
یاسمن رشک سمن جانِ چمن یا جان من

آشنائے دلربائے خودنمائے خودسرے

تو ہے بحر بیکراں اور میں ذرا سی آبجو
اے سراپا نور تو ہے دو جہاں کی آبرو
مرحبا صلِّ علیٰ جان جہانِ رنگ و بو
قیصریت تیری آمد سے ہوئی ہے زرد رو
کفر سوزے دل فروزے خوب رو آہستہ خو

پاک دینے پاک بینے خوشتر از ہر خوشترے

اختر تاباں کہوں یا مہ کامل تجھے
میں کہوں کون و مکاں کی جان یا پھر دل تجھے
میں سمجھتا ہوں نشان جادۂ و منزل تجھے
دل کھچیں بے ساختہ وہ ہے کشش حاصل تجھے
نازنینے مہ جبینے دل کشے یا دل کشے

جان گداز سے دل نواز سے گوہرے یا اخترے

کوچہ جاناں گئے تو بن کے دیوانہ گئے
بادۂ عشق و محبت پی کے مستانہ گئے
صبر آیا جب نہ ہم کو پھر تو روزانہ گئے
نعت یہ پڑھتے ہوئے بے اختیارانہ گئے
شادۂ آزادۂ مستانۂ جانانۂ

مست چشمے دیر خشمے طرفہ زیبا منظرے

اے سراپا خلق تیری ذات ہے ہر دلعزیز
تیرے صدقے میں خدا نے دی ہمیں عقل و تمیز
تیرے در کی خاک ہی سرمہ بنانے کی ہے چیز
توڑنا دم تیرے در پر جان و دل سے ہے عزیز
بے قرارم اشک بارم سخت زارم اے عزیز

دل بر د جاں آورد ہر دم بطرز دیگرے

رات زیادہ ہو گئی تھی، صاحبِ ذوق میزبان نے اس پُرنور محفل کو آخری نعتیہ شعر پر ختم کیا جو اس محفل کے خاتمہ کے لئے بہت موزوں تھا، یہ شعر فارسی کے مشہور مصرع "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کی طرح بڑا جامع اور فیصلہ کن ہے، اور اپنی بلاغت کے ساتھ ایسی صداقت اور واقعیت کا حامل ہے کہ اس میں کسی بڑے سے بڑے محتاط اور بڑے سے بڑے ادب شناس کو بھی کلام نہیں ہو سکتا، یہ آسی غازی پوری کا شعر ہے، جس پر اس ادبی نشست کا اختتام ہوا اور حاضرین مجلس اسی کو ورد زبان کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر واپس گئے، شعر یہ ہے ؂

صبا یہ جا کے تو کہیو مرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد